تذکرہ

حافظ محمد الیاس برنالوی رحمہ اللہ تعالیٰ

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر حافظ محمود الحسن عارف
ایم اے ، پی ایچ ڈی

شایع کردہ
شعبہ نشر و اشاعت ، جامع مسجد مدینہ
کوٹ پنڈی داس ضلع شیخوپورہ

تذکرہ

حافظ محمد یسین کرنالوی رحمہ اللہ تعالیٰ

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر حافظ محمود الحسن عارف

ایم اے، پی ایچ ڈی

شائع کردہ

شعبۂ نشر و اشاعت، جامع مسجد مدینہ

کوٹ پنڈی داس، ضلع شیخوپورہ

معاونین

۱- حاجی محمدؐ رمضان صاحب (حافظ صاحب مرحوم کے سُسر)
۲- حافظ احمد علی صاحب (نسبتی بھائی اور شاگرد رشید)
۳- حافظ محمدؐ اسماعیل صاحب (شاگرد و جانشین)

بار اوّل : رجب المرجب ۱۴۰۸ھ / مارچ ۱۹۸۸ء
قیمت :
ملنے کا پتہ : حافظ محمدؐ اسماعیل : ناظم شعبۂ نشر و اشاعت
جامع مسجد مدینہ، کوٹ پنڈی داس ضلع شیخوپورہ

کتبہ: سیّد محمدؐ سرور

المطبعة العربية
۳۰- ایبک روڈ، بالمقابل [illegible] انارکلی، لاہور (پاکستان)

انتساب

حافظ محمد لئیق قدس سرہٗ کے والد

میاں جی احمد علی مرحوم و مغفور

اور

مؤلف تذکرہ ہذا کے والد

میاں جی عمر دین، مرحوم و مغفور

کے نام

جن کی نیک تربیت نے دونوں کی اولاد کا مستقبل سنوارا۔

فہرست عنوانات

پیشِ لفظ

یوں توچمنستان عالم ہزاروں گلہائے لالہ رنگ سے آراستہ وپیراستہ ہے، اسکا دامن قلب ہزاروں گرانقدر موتیوں اور جواہرات سے مرصّع ہے، اس کی ہر صبح "خونِ صد ہزار انجم" سے پیدا شدہ ہے، مگر پھر بھی تاریخ اسلام کی بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں، جو سدا بہار پھول بن کر "چمن رنگا رنگ" کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھتی ہیں اور تاریخ انھیں کوشش کے باوجود نظر انداز نہیں کرسکتی کہ :

ع ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

ہمارے ممدوح "حافظ محمد الیاس کرنالوی" بھی ایسے ہی اساتذہ اور فرزندانِ علم کے تربیت یافتہ تھے، اسی بنا پر انھیں ان کے مثالی زہد و تقویٰ اور اپنے علم و ثقاہت نیز مخصوص انداز خطابت کی بنا پہ تا دیر یاد رکھا جائے گا۔ ضلع شیخوپورہ کے نامور قصبے کوٹ پنڈیداس (شاکر آباد) کے ہر پیر و جوان کے دل پر آج بھی آپ کا نام مرتسم ہے اور شاید ہمیشہ رہے گا، زیر نظر کتابچہ انہی کے وقائع و احوال پر مشتمل ہے۔

السعی منی والاتمام من اللہ۔

اس کا ضروری مواد "حاجی محمد رمضان صاحب، حافظ احمد علی صاحب اور حافظ محمد اسماعیل صاحب نے مہیا کیا، جسے راقم الحروف نے ترتیب دے کر موجودہ شکل دی، شاید یہی کام عاقبت کی درستگی اور کامیابی کا ذریعہ بن جائے کہ :

نام نیک رفتگان ضائع مکن

تاکہ ماند نام نیکت برقرار

ناچیز مؤلف محمود الحسن عارف

گلشن راوی - لاہور

باب اوّل

قوم و قبیلہ

حافظ محمد لئیق کرنالویؒ برصغیر پاک و ہند کی مشہور قوم "کمبوہ" کے ایک نامور فرزند تھے۔ یہ قوم ایک "شاندار ماضی" اور عظیم روایات کی حامل ہے۔

محققین کے خیال میں بنیادی طور پر کمبوہ قوم ایک آریائی قوم ہے، جو وسطِ ایشیا سے اُٹھ کر اکنافِ عالم میں پھیلی[1]۔ منوسمرتی کے مشہور زمانہ قانون میں اسے من جملہ "چھتری" اقوام کے شمار کیا گیا ہے، جو کھیتی باڑی سے لے کر فوجی خدمات تک تمام کام حُسن و خوبی سے انجام دیتی آئی ہے[2]۔

اس قوم کا آغاز مشہور ایرانی حکمران اور فاتح کورش اعظم یا سائرس (جسے مولانا ابوالکلام آزاد اور دورِ حاضر کے بعض دیگر محققین نے قرآنی ذوالقرنین قرار دیا ہے[3]) کے بڑے صاحبزادے "کمبوجیا" سے ہوا۔ کمبوجیا مذکور اپنے عظیم باپ کا عظیم جانشین تھا، مگر تقدیر اس کے خلاف چال چل گئی اور عین اس وقت جب وہ ایک لشکر جرّار کے ساتھ "مملکت مصر" کی تسخیر میں مصروف تھا، اس کے خلاف سازش کامیاب ہو گئی اور اسے تاج و تخت اور اپنا وطن چھوڑ کر افغانستان اور بعد ازاں سواحل و اندرون ہند آ کر آباد ہونا پڑا۔ ان دونوں ممالک

---

[1] دیکھیے چوہدری عبدالرباب: تاریخ کمبوہاں، باب اوّل۔ ص ۵۸ تا ۱۶۷ -

[2] ایضاً، ص ۸ وغیرہ -

[3] ایضاً؛ نیز مولانا آزاد: اصحاب کہف، مطبوعہ لاہور۔

کے متعدد مقامات کے ناموں میں ابتک اس نسبت کا تاثر موجود ہے ہندوستان کی مشہور ریاست کھمبایت یا کمبایت، جہاں اس خاندان کی صدیوں حکومت رہی، اس سلسلے کی سب سے مشہور مثال ہے۔

جنگ مہابھارت میں "کمبوہ راجہ" نے بدقسمت کوروں کی حمایت میں اپنے لشکر سمیت شرکت کی تھی، اسی بنا پر اس کا نام بھی ہندوستان کے من جملہ راجوں اور مہاراجوں کے اس کتاب کی زینت ہے۔

مشہور فاتح محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ سے ہندوستان میں جو روحانی انقلاب پیدا ہوا اور جس کے نتیجے میں اس کفرستان میں نورِ اسلام پھیلا، یہ قوم اسی کے نتیجے میں مشرّف با سلام ہوئی چنانچہ برصغیر پاک و ہند میں ابتک مسلمان کمبوہوں کے ساتھ ہندو اور سکھ کمبوہ بھی بکثرت موجود ہیں[1]

قدیم ترین بزرگ جو دولت اسلام سے مشرّف ہوئے، حضرت دیوان شیر محمد جاولیؒ تھے، جو مشہور روایت کے مطابق ملتان کی ایک نواحی کمبوہ ریاست کے راجکمار (راجہ کے بیٹے) تھے اور جنھیں محمد بن قاسمؒ نے گرفتار کر کے دمشق میں بھیج دیا تھا۔ وہ اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی کوشش سے مسلمان ہوئے اور پھر اپنے علاقے میں بہادری سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا کام سرانجام دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ آپ کا مزار موضع کھوتے وال نزد بورے والہ (ضلع وہاڑی) میں مرجع عوام و خواص ہے[2]۔

"کمبوہ قوم" ابتدا سے ہی مردم خیز قوم رہی ہے۔ اس قوم نے سیکڑوں اربابِ علم و فضل اور مجاہدین صف شکن کو جنم دیا، جنہوں نے ہر دور کی معاشی اور سیاسی دنیا میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔

علم و ادب، فکر و فن اور صنعت و حرفت کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا، جسے

---

[1] تاریخ کمبوہاں، باب اوّل تا ہشتم۔ [2] ایضاً ص ۱۸۵۔

اس قوم کے اولوالعزم فرزندوں نے مسخر نہ کیا ہو۔ اسی بنا پر اس قوم کے مشہور افراد کا ذکر ہر دور کی تاریخ کا اہم موضوع ہے۔

جس قوم نے حضرت دیوان شیر محمد جاؤلیؒ، علامہ شیخ جمالیؒ اور شیخ گدائیؒ جیسے اکابر صوفیا، مفتی جمال خان، مفتی ابوالبرکاتؒ، مفتی محمد اکرمؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی دیوبندی جیسے علماء و فقہا، شیخ عبدالعزیز (مدار المہام سلطان ابراہیم لودھی)، نواب شہباز خان، نواب کرم اللہ اور شیخ عبدالمؤمن جیسے سپہ سالار اور جرنیل، شیخ محمد صالح (صاحب عمل صالح المعروف بہ شاہجہان نامہ)، شیخ عنایت اللہ (میر منشی شاہجہان)، نواب وقار الملک (سر سید احمد خان کے دست راست) اور ڈاکٹر ضیاء الدین (سابق وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی) جیسے ارباب علم و فضل کی پرورش کی ہو اس قوم کے "شاندار ماضی" کا خود ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے: قیاس کن زگلستان من بہار مرا

متاخر دور میں بھی اس قوم کے بے شمار فرزندوں نے تعلیم، سیاست صحافت کھیل اور سائنس کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، جن کا ذکر موجب طوالت ہوگا۔ لیکن اصل بات وہی ہے جو اس سلسلے میں قرآن مجید میں کہی گئی ہے:

اے لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک (ہی) مرد و عورت سے پیدا کیا اور تمہارے لیے خاندان اور کنبے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (الحجرات)۔

خاندان، آباؤ و اجداد

۱۔ اجداد حافظ محمد لیس کرنالویؒ کا خاندان قدیم زمانے سے ضلع کرنال (دہلی ڈویژن) کے قصبہ "تارانوالی" میں آباد تھا۔ یہیں آپ کی موروثی زمین بھی تھی۔ تقسیم ملک کے بعد آپ کا خاندان سندھ اور پنجاب کے مختلف علاقوں میں متفرق طور پر آباد ہوا۔ اجداد میں سے صرف پڑدادا تک کے حالات مل سکے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

د۔ محمد اکبر (پڑدادا):

حافظ صاحبؒ کے پڑدادا کا نام محمد اکبر تھا، وہ گو پڑھے لکھے تو نہ تھے، تاہم وہ شریف الطبع اور نیک طینت بزرگ ضرور تھے۔ تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) سے بہت پہلے انکی وفات ہوگئی تھی، انہوں نے اپنی تین زندہ یادگاریں چھوڑیں:

۱۔ حاجی محمد جیونا؛ ۲۔ نور محمد؛ ۳۔ کاندھل، ان میں سے اوّل الذکر حافظ صاحب کے جد امجد ہیں۔

ب۔ حاجی محمد جیونا:

حافظ صاحب کے دادا حاجی محمد جیونا بھی اپنے اسلاف کی زندگی کا نمونہ تھے، انہوں نے لمبی عمر پائی۔ تقسیم ملک کا ہنگامہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر جب وہ آگ اور خون کا دریا عبور کر کے "سرزمین پاک" پر پہنچے تو تن کے تین کپڑوں کے سوا ان کے اور انکے اہل خانہ کے پاس کچھ نہ تھا۔ وہ اپنے خاندان سمیت کچھ عرصہ کوٹ لکھپت کے "مہاجر کیمپ" میں ٹھہرے رہے۔ بعدازاں موضع گوٹھ لسی (ضلع سانگھڑ تحصیل ٹنڈو آدم) میں جا کر مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ یہیں سے انھیں حج بیت اللہ اور زیارت حرمین شریفین کا شرف حاصل ہوا۔ اچھی اور کامیاب زندگی بسر کر کے یہیں انتقال فرمایا اور یہیں مدفون ہوئے انکے چار بیٹے تھے:

۱۔ الحاج میانجی احمد علی حافظ صاحب کے والد ماجد (تفصیل آگے آتی ہے)۔

۲۔ قطب الدین: یہ حافظ صاحب کے تایا اور حاجی محمد جیونا کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے والد ماجد کے ساتھ صوبہ سندھ کے موضع لسی میں سکونت اختیار کرلی۔ ان کا عالمِ کہولت میں انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے حافظ محمد اکبر قرآن مجید کے حافظ، قاری اور عالمِ باعمل ہیں۔ فی الوقت میرپور خاص (سندھ) میں وعظ و خطابت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

۳۔ حاجی محمد منشی | حاجی منشی صاحب، حاجی محمد جیونا کے تیسرے صاحبزادے تھے۔

انھیں بھی "قیام لبی" کے بعد "حج بیت اللہ" کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان کے فرزند حافظ محمد اولیس صاحب بفضلہٖ تعالیٰ فاضل درس نظامی ہیں اور فی الوقت نواب شاہ کے مدرسہ جامعہ محمدیہ کے صدر مدرس اور مفتی کے طور پر فرائض منصبی انجام دیتے ہیں۔

۴۔ علی محمد | میاں جی احمد علی کے چھوٹے بھائی علی محمد صاحب (تادم تحریر ۱۹۸۸ء) بفضلہٖ تعالیٰ حیات ہیں اور موضع گوٹھ لبی میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کے تین بیٹوں میں ایک بیٹے مولانا محمد خلیل صاحب (مرحوم) عالم باعمل تھے، لدھیوالہ ضلع گوجرانوالہ میں خطیب و امام کے فرائض انجام دیتے ہوئے بیمار پڑے اور موضع گوٹھ لبی (ضلع سانگھڑ) میں وفات پائی۔

والد ماجد: میاں جی احمد علی

حافظ صاحبؒ کے والد گرامی میاں جی احمد علی ایک انتہائی نیک طبیعت اور صالح بزرگ تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی گو غفلت و لاپروائی میں گذری تھی، مگر بعد میں انہیں صلاح و تقویٰ اور پاکبازی کی جو توفیق ملی، وہ بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔

میاں جی احمد علی بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں ضلع کرنال کے موضع "تارانوالی" میں پیدا ہوئے۔ قوم میں لکھنے پڑھنے کا رواج کم ہونے کی بنا پر، دینی اور دنیوی تعلیم سے بے بہرہ رہے۔ مگر خدا تعالیٰ نے انھیں "ذوق سلیم" اور "فطرت صحیحہ" کا وافر حصّہ نصیب کیا تھا، اسی بنا پر غفلت سے نیکی کی طرف ان کی کایا پلٹ ہوتے زیادہ دیر نہ لگی۔ شیخ سعدیؒ نے شاید ایسے ہی لوگوں کی نسبت فرمایا ہے کہ:

"درجوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبراں"

میاں جیؒ نے لاپروائی سے نیکی و پارسائی کی زندگی اختیار کرنے پر ہی اکتفا نہیں فرمائی بلکہ اپنی اولاد کو پڑھانے اور نیک بنانے کا عزم بالجزم بھی کیا، جس کی تفصیل آئندہ اوراق

میں بیان ہوگی۔

ان کی طہارت نفس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد جب مہاجرین کے قافلے کے ساتھ "سرزمین پاک" پر پہنچے، تو عین ان دنوں جبکہ "بندگان طمع و آز" زر اور زمین کے چکروں میں پڑے ہوئے تھے، انہوں نے تبلیغی جماعت کے ساتھ "چلہ" لگا کر "سرزمین پاک" میں اپنی متوکلانہ زندگی کا آغاز کیا۔

خاندان کے ساتھ موضع گوٹھ لبی میں جا کر آباد ہوئے وہاں موروثی زمین کی الاٹمنٹ ہوئی۔ مگر بعد ازاں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر موضع کوٹ پنڈی داس کے دینی مدرسہ، مدرسہ کاشف العلوم میں چلے آئے اور بقیہ زندگی اللہ اللہ کرتے اور مہمانان رسولؐ (طالب علموں) کی خدمت میں گذار دی۔

مدرسہ کاشف العلوم میں آمد اور طلبا کی خدمت و خبر گیری:

موضع کوٹ پنڈی داس میں، جہاں کمبوہ برادری کی بڑی اکثریت ہے، ۱۹۶۱ء میں ایک دینی مدرسہ بنام "مدرسہ کاشف العلوم" قائم کیا گیا۔ اس مدرسہ میں بیرونی اور مقامی دونوں طرح کے طلبہ تعلیم قرآن پاتے تھے؛ اپنے قیام کے چند سالوں کے اندر ہی اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، اور متعدد اضلاع، مثلاً لاہور، قصور، کوہاٹ اور پشاور وغیرہ تک کے طالب علم یہاں پہنچنے لگے۔ مدرسہ میں طلبہ کو ہمہ وقتی قیام و طعام کی سہولتیں بھی فراہم کی گئی تھیں۔

مدرسہ کی یہ انتہائی خوش قسمتی تھی کہ ابتدا سے ہی جو اساتذہ اسے میسر آئے وہ تمام نہایت مخلص اور سخت محنتی تھے۔ ابتداءً حافظ محمد ایوب صاحب (مدظلہٗ)، حافظ رحمت اللہ صاحبؒ (مرحوم) اور ایک نابینا استاد (نام نامعلوم) یہاں تعینات تھے ان کے علاوہ مولوی علم دین اور ناظم علی حسن صاحب بھی زیادہ تر مدرسہ میں ہی ٹھہرتے اور نگرانی کے کام میں اساتذہ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ راقم الحروف کے اندازے کے مطابق (جو اس زمانے میں مذکورہ

مدرسے کا ایک آٹھ نو سالہ طالب علم تھا اور جسے اس مدرسہ میں سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی)، اس وقت ایک سو کے لگ بھگ بیرونی اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں مقامی طلبہ زیر تعلیم تھے۔

بیرونی طلبہ کا کھانا مدرسہ کے مطبخ میں پکتا تھا۔ جس کی صورت یہ تھی کہ ناظمِ مدرسہ علی حسن صاحب اپنی دوکان سے اجناس (آٹا، چاول اور دالیں وغیرہ) مدرسہ میں پہنچا دیتے تھے۔ اور دو دو طالب علم باری باری کھانا تیار کرتے تھے۔ چھوٹے طالب علم باری (TURN) سے مستثنیٰ ہوتے تھے، چونکہ اکثر طالب علم کھانا پکانے سے ناواقف تھے، اسی بنا پر ان کی سرپرستی اور نگرانی کے لیے کسی تجربہ کار شخص کی ضرورت رہتی تھی، جو شفیق اور مہربان ہونے کے ساتھ کھانا پکانے کے فن سے بھی واقف ہو، قدرت نے نواح ۱۹۶۳ء میں اس نیک کام کے لیے حافظ محمد الیاس صاحب کے والد ماجد میاں جی احمد علی صاحب کو بھیج دیا، جو اپنی وفات (نواح ۱۹۶۵ء) تک نہایت خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے یہ فریضہ سرانجام دیتے رہے۔

طلبہ کے ساتھ میاں جی کو بیحد محبت و شفقت تھی۔ وہ بڑی محبت شفقت کیساتھ بچوں کو کھانا پکانا سکھاتے تھے اور گو ان کا کام صرف نگرانی کرنا تھا، مگر وہ طالب علموں کے ساتھ ہر کام میں برابر شریک رہتے۔ راقم الحروف نے متعدد بار ان کو دھوئیں سے بھرے مطبخ میں نہایت اطمینان سے کام کرتے دیکھا ہے۔

جب کھانا تیار ہو جاتا تو گھنٹی بجائی جاتی اور طالب علم کھانا کھانے کے لیے مطبخ میں چلے آتے۔ یہاں باری کے دونوں طالب علم دسترخوان بچھانے، پانی پلانے، روٹی سالن پہنچانے پر مامور ہوتے تھے اور خود میاں جی صاحب مُقسّم (تقسیم کنندہ) کے فرائض انجام دیتے تھے۔ کھانا عموماً کفایت سے پکایا جاتا تھا۔ اسی بنا پر پیچھے بہت کم کھانا بچتا تھا مگر بایں ہمہ وہ سب سے بعد میں بچا کھچا کھانا کھاتے تھے۔ طالب علموں کی نظروں میں ان کی

حیثیت ایک شفیق و مہربان والدہ جیسی تھی، جو بچوں کے ہر دُکھ درد میں ان کے شریک حال رہتی ہے۔

مدرسے کے سامان اور اشیا کی حفاظت کا انھیں ہمیشہ بہت خیال رہتا تھا کسی چیز کو ضائع کرتے اور نہ ضائع ہونے دیتے۔ اناڑی پکانے والوں کے ہاتھوں بعض اوقات روٹیاں جل جاتیں اور طالب علم ان جلے ہوئے حصّوں کو الگ کر دیتے، مگر میاں جی مرحوم طلبہ کو نہایت شفقت کے ساتھ یہ جلے ہوئے حصّے بھی کھانے کی ترغیب دیتے اور فرماتے کہ "یہ تو خالص نور ہے" اور پھر وہ اس "نور" کو دیکھتے ہی دیکھتے سب کے سامنے بڑے شوق اور رغبت کے ساتھ اس طرح کھاتے گویا وہ بڑے ہی لذیذ ٹکڑے ہیں۔ کچھ یہی ماجرا "خراب سالن" کے ساتھ بھی گذرتا تھا۔

بیماری اور وصال میاں جی مرحوم یہ عہد کر کے آئے تھے کہ اب بقیہ زندگی وہ طالب علموں کی خدمت میں گذاریں گے اور گھر واپس نہ جائیں گے، قدرت کو ان کا یہ عہد بہت پسند آیا۔ یہاں قیام کا تیسرا سال ہو گا کہ ان پر "جگر کے ضعف" کا شدید حملہ ہوا۔ جگر نے اپنا طبعی کام کرنا بند کر دیا۔ مگر بیماری کے باوجود انہوں نے طلبہ کی خدمت گذاری کا سلسلہ جاری رکھا، آخر پورے جسم بالخصوص چہرے اور پاؤں پر ورم آ گیا، حافظ محمد یٰسین صاحب ان ایام میں کوٹ پنڈی داس تشریف لا چکے تھے، انہوں نے بمشکل انہیں علاج معالجے پر آمادہ کیا اور علاج معالجے سے بھی جب افاقہ نہ ہوا تو پھر انہیں موضع گوڑلیسی بھجوا دیا۔ جہاں کچھ روز بیمار رہ کر انہوں نے ۱۳۸۵ھ / ۱۹۶۵ء میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ۔ انہیں یہیں موضع گوڑلیسی ہی میں سپردِ خاک کیا گیا۔

شروع سے ہی میاں جی مرحوم کو اپنی اولاد کی دینی تعلیم کا بڑا خیال رہتا تھا۔ جب حافظ صاحب زیر تعلیم تھے تو میاں جی ان کے عالم باعمل بننے کے لیے مختلف علما اور صوفیا سے دعائیں کرواتے تھے، خدا تعالیٰ نے ان کی زندگی میں ہی ان کی یہ خواہش پوری کر دی

تھی اور حافظ صاحب فارغ التحصیل ہو کر موضع کوٹ پنڈی داس میں دینی خدمت میں مصروف ہو چکے تھے۔

والدہ ماجدہ

حافظ صاحب کی والدہ ماجدہ بھی ایک نہایت نیک اور پارسا خاتون ہیں انہیں بھی حافظ صاحب کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ فی الوقت (تا دم تحریر) وہ حیات ہیں اور حافظ صاحب کے بڑے بھائی "محمد یامین" کے ہاں موضع لدھیوالہ ضلع گوجرانوالہ میں سکونت پذیر ہیں۔

خاندان، بھائی بہن

حافظ صاحب کا خاندان چار بھائیوں اور ایک بہن پر مشتمل تھا، دو بھائی ایام طفلی میں رحلت فرما گئے، جبکہ تیسرے بھائی محمد امین صاحب حیات ہیں۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک کسان ہیں اور موضع لدھیوالہ، ضلع گوجرانوالہ میں اپنی آبائی زمین کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

حافظ صاحب اور محمد یامین دونوں کو ہی ان کے والد ماجد نے تحصیل علم کے لیے چھوڑا تھا، مگر محمد یامین صاحب کا "شغل تعلیم" میں دل نہ لگا، اس طرح قیام پاکستان کے بعد وہ مکمل طور پر کھیتی باڑی کے ہو کر رہ گئے، ماشاءاللہ موضع مذکور میں صاحب اولاد ہیں اور اپنی شریفانہ ساکھ رکھتے ہیں۔ ان کے اور حافظ صاحب مرحوم کے باہمی تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے، حافظ صاحب اپنی زندگی میں موضع گوٹھ لبی ان کے ہاں اور وہ حافظ صاحب کے ہاں بکثرت آمد و رفت رکھتے تھے۔

حافظ صاحب کی صرف ایک بہن تھی، جو موضع گوٹھ لبی، ضلع سانگھڑ میں بیاہی گئی ہے۔

باب دوم

پیدائش، نام اور حصولِ تعلیم

۱۔ پیدائش | حافظ صاحبؒ اسی خاندان میں، میاں جی احمد علی مرحوم کے ہاں تواح ۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء میں ضلع کرنال کے ایک معروف قصبے "تارانوالی" میں پیدا ہوئے۔ اسی سال دنیا میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا، جو ۱۹۴۵ء تک جاری رہی۔

جنگِ عظیم دوم کے شروع ہوتے ہی ہندوستان میں تحریکِ آزادی زور پکڑ گئی تھی۔ ادھر ایک سال بعد ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں قیامِ پاکستان کی قرارداد مسلم لیگ نے منظور کر کے اس کے قیام کی عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا، القصّہ اسی شورش، بدامنی اور جدوجہدِ آزادی کے عالمِ شباب میں حافظ صاحب مرحوم نے آنکھ کھولی۔ اسی بنا پر "جدوجہد" اور "عزم و جوان ہمتی" ان کی طبیعت کا خصوصی وصف تھا۔

۲۔ نام | والدین نے حافظ صاحب کا نام پیدائش کے بعد علم الدین (دین کا علم) رکھا گویا پیدائش کے وقت ہی ماں باپ کی یہ خواہش تھی کہ ان کا بچہ بڑا ہو کر دنیا کا نہیں، بلکہ دین کا، ظاہر کا نہیں، بلکہ باطن کا اور مادی علوم کا نہیں بلکہ روحانی علوم کا وارث بنے اور "العلماء ورثة الانبیاء" کا مصداق ٹھہرے۔ خداوند تعالیٰ نے والدین کی یہ خواہش پوری کر دی۔

جب حافظ صاحب تحصیل علم اور حفظ قرآن کے لیے موضع نواں گاؤں میں حافظ "علی شیر" کے پاس آئے تو انہوں نے حافظ صاحبؒ کا نام تبدیل کر کے "محمد الیاس" رکھ دیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں "علم الدین" کا نام ہندوستان میں معروف ہونے کے باوجود اہل علم کے حلقوں میں چنداں معروف و متداوّل نہیں ہے، اسی بنا پر انہوں نے یہ نام تبدیل کر دیا۔

۳۔ نسبت | درس نظامی سے فراغت پانے کے بعد حافظ صاحبؒ نے اپنی نسبت "کرنالوی" تجویز کی ، جس میں اپنے مولد و مسکن ضلع کرنال سے محبت و رغبت اور فراواں جذبۂ ہجرت کا اشارہ ملتا ہے ۔ ان کی مہر پر حسب ذیل عبارت کندہ ہوتی تھی :

"حافظ محمد الیاس کرنالوی "

۴۔ ابتدائی تعلیم | حافظ صاحب کے والدین اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے ، مگر شوق علم اور طلب صادق میں کسی پڑھے لکھے خاندان سے کم نہ تھے ، اسی بنا پر جب حافظ صاحبؒ نے عمر کے پانچ سال پورے کر کے چھٹے سال میں قدم رکھا اور کھیل کود کی زندگی سے "پختہ کاری" کی پہلی منزل میں داخل ہوئے تو انہیں ان کے بھائی محمدؐ یامین سمیت موضع نواں گاؤں کے مدرسہ تعلیم الاسلام میں حافظ علی شیر صاحب مرحوم و مغفور کے پاس نواح ۱۹۴۴ء۔ ۱۹۴۵ء میں پڑھنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ۔ یہاں کچھ عرصہ تو دونوں بھائی پڑھتے رہے ، مگر کچھ دنوں کے بعد محمدؐ یامین کا دل تعلیم سے اچاٹ ہو گیا تو اساتذہ نے انہیں واپس نارنوالی بھجوا دیا۔

جس وقت حافظ صاحبؒ کو داخل مدرسہ کیا گیا ، اس وقت جنگ عظیم دوم آخری فیصلہ کن موڑ میں داخل ہو چکی تھی اور جرمنی ہر محاذ پر پے بہ پے شکست سے دوچار تھا ، اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں انگریز سامراج کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" کی کانگرسی اور "بن کے رہے گا پاکستان" کی مسلم لیگی تحریک اپنے جوبن پر تھی ۔ الغرض ملکی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر یہ زمانہ سخت افراتفری و انتشار کا زمانہ تھا ۔ مگر ان سب ہنگاموں سے بے نیاز ہو کر ایک چار پانچ سالہ بچہ "مدرسہ" میں خاموشی کے ساتھ حصول علم میں مصروف تھا۔

نواں گاؤں کے مذکورہ مدرسے میں حافظ صاحب دو اڑھائی سال تک زیر تعلیم رہے ۔ قرآن مجید کے حفظ کا یہیں سے آغاز کیا مگر تکمیل کی نوبت پاکستان میں آنے کے بعد آئی ۔ یہیں حافظ صاحب کا پرانا نام علم الدین تبدیل کر کے محمد الیاس رکھا گیا ۔

قیام پاکستان سے کچھ ہی عرصہ قبل (۱۹۴۶ - ۱۹۴۷ء میں) میاں جی احمد علی صاحب

نے اپنے فرزندِ ارجمند کو "نواں گاؤں" سے بلا کر ضلع کرنال کے ایک اور گاؤں "چابڑی" کے مدرسہ تجوید القرآن میں، قاری امیر الدین صاحب کے ہاں داخل کرا دیا۔ یہاں حافظ صاحب ایک سال کے قریب زیرِ تعلیم رہے۔

پاکستان کی طرف ہجرت

بالآخر ہندوستان کی آزادی کی تحریک کامیاب ہوگئی؛ علامہ اقبالؒ کا دیکھا ہوا خواب قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ کے ذریعے شرمندۂ تعبیر ہوگیا۔ یوں ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو قیامِ پاکستان اور ۱۵ کو آزادیٔ ہندوستان کا اعلان ہوگیا۔

پاکستان کا قیام چونکہ ہندو بنیوں کی سُوچ کے خلاف تھا، اسی بنا پر وہ شروع دن سے اس کے شدید ترین مخالف تھے۔ اس مخالفت میں شدت "اعلانِ آزادی" نے پیدا کردی۔ چنانچہ مشرقی پنجاب بشمول ریاست پٹیالہ کے طول و عرض میں ہندوستان کی تاریخ کے بدترین اور ہولناک ترین فسادات و مظالم کی آگ بھڑک اٹھی۔ چونکہ ہندو پولیس اور فوج "بلوائیوں" کی پشت پناہ تھی، اسی بنا پر ہندو اور سکھ جتھوں نے دل کھول کر خونِ مسلم سے ہولی کھیلی[1]۔

کمبوہ برادری، جو ریاست پٹیالہ اور ضلع کرنال کی آبادی کا بہت بڑا حصہ تھی اب تک بڑے امن اور سکون سے اس علاقے میں آباد اور اس علاقے کی خوشحالی کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ برادری کے بہت سے لوگ چونکہ "ہندو" اور سکھ مذاہب سے بھی تعلق رکھتے ہیں، اسی

---

[1] قدرت ظلم کا بدلہ ضرور لیتی ہے، مشرقی پنجاب میں جس طرح "ہندو سکھ" گٹھ جوڑ نے مسلمانوں پر مظالم ڈھائے تھے، اب اس کا انتقام شروع ہوچکا ہے۔ ہندوستان میں سکھوں اور ہندوؤں کی باہم ٹھن چکی ہے، یہ تو ابھی ابتدائے عشق ہے اور

ع آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

بنا پر یہاں کی فضا کبھی کشیدہ نہیں ہوئی تھی۔ مگر قیام پاکستان کے اعلان نے یکسر حالات کا رُخ پلٹ دیا اور ایک ہی برادری کے لوگ اپنی ہی برادری کے خون کے پیاسے ہو گئے، گو کچھ استثنائی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

اس علاقے میں مسلمان مختلف چھوٹے بڑے قصبات میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں سے جو بروقت اپنے اپنے علاقوں سے نکل آئے سو نکل آئے، مگر جنہوں نے ذرا سی دیر کی، انھیں وہیں ختم کر دیا گیا اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ اس علاقے کے مسلمانوں کا حافظ صاحب کے گاؤں موضع "تارانوالی" میں کیمپ لگایا گیا تھا، جس میں آئے دن اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں اگست سے ۱۹ نومبر تک لوگوں کے چھوٹے بڑے قافلے آ آکر اکٹھے ہوتے رہے۔ قائد اعظم کی خاص ہدایات کے تحت بلوچ رجمنٹ کے جوانوں کو اس قافلے کو باعزت طریق سے لانے کا کام سونپا گیا۔ جو اس رجمنٹ نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

یہ عظیم الشان تاریخی قافلہ ۱۹ نومبر ۴۷ء بروز بدھ اپنے مرکز تارانوالی۔ ماجری سے روانہ ہوا۔ راستے میں اس سمندر میں چھوٹے بڑے اور قافلے ملتے اور جذب ہوتے گئے۔ جب یہ قافلہ گمتھلہ (ضلع کرنال موضع حابڑی کے قریب) پہنچا تو حافظ صاحب کے والد گرامی انھیں موضع مذکور سے لے آئے۔ اس طرح حافظ صاحب شریکِ کاروانِ ہجرت ہو گئے۔

قافلہ، جو کئی میل لمبا تھا اور ہزاروں خانماں برباد خاندانوں پر مشتمل تھا اور جو دن کو سفر کرتا اور رات کو کسی مناسب جگہ پر پڑاؤ ڈال لیتا، پون ماہ کے مسلسل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد براستہ فیروزپور۔ قصور ۱۱، دسمبر ۴۷ء کو کوٹ لکھپت کے "مہاجر کیمپ" میں پہنچا۔ یہاں قائد اعظم کی ہدایت پر حکومت پاکستان کی طرف سے تقریباً تین مہینوں تک "خانماں برباد مہاجرین" کو راشن پانی ملتا رہا۔ حافظ صاحب بھی اپنے

والدین کے ہمراہ اس کیمپ میں مقیم رہے۔

سفرِ تبلیغ اس سفرِ ہجرت نے میاں جی احمد علی کے دل پر سخت اثر کیا اور دنیا کی بے ثباتی و کم مائگی کا احساس ان میں اور زیادہ پختہ ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے مہاجر کیمپ میں قیام کے دوران میں ہی اپنے اہل خاندان کو خدا کے سپرد کیا اور خود اپنے فرزند ارجمند (حافظ صاحب) سمیت چار مہینوں (۳ چلوں) کے لیے عازمِ تبلیغ ہو گئے اور قریہ بقریہ گھوم پھر کر تبلیغ و دعوتِ دین پیش کرتے رہے۔

مدرسہ کاشف العلوم بلال پارک میں داخلہ باغبانپورہ لاہور شہر کے قدیم ترین محلات میں سے ایک محلہ ہے، جسے شالامار باغ کے مالیوں نے آباد کیا تھا۔ اگر اسی باغبانپورہ سے لاہور ریلوے سٹیشن کی طرف جائیں تو راستے میں دائیں طرف "محلہ سنگھ پورہ" آتا ہے۔ جو قیام پاکستان سے پہلے متعصب سکھوں کا گڑھ تھا، اس علاقے کے ایک چھوٹے سے حصے کا نام، جو قیام پاکستان کے بعد آباد ہوا، "بلال پارک" ہے۔ بلال پارک میں مؤذن نبوی حضرت بلال رضؓ حبشی کے نام نامی سے منسوب ایک عالیشان مسجد ہے، مدرسہ کاشف العلوم اسی مسجد میں قائم ہے۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور شہر میں تبلیغی جماعت کے "مرکز" بننے کا قرعۂ فال اسی مسجد کے نام پڑا اور یوں اس مسجد اور اس مدرسے کی شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ فی الوقت یہاں ایک عالی شان مسجد اور مدرسہ قائم ہے جس میں متعدد اساتذہ تعلیم و تحفیظ قرآن کی خدمت پر مامور ہیں۔

حافظ صاحب اپنے والد ماجد کے ساتھ جب "تین چلّے" پورے کر آئے تو میاں جی احمد علی صاحب نے انھیں اسی مدرسہ کی کفالت میں دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس زمانے میں حافظ خیر الدین (مرحوم) اور قاری محمد صدیق صاحب جیسے مشفق اساتذہ بچوں کی تعلیم پر مامور تھے۔ ان دونوں اساتذہ نے حافظ صاحب کو اتنی محبت اور شفقت کے ساتھ پڑھایا

کہ حافظ صاحب کے دل میں ان اساتذہ کی ہمیشہ عزّت اور قدر و منزلت قائم رہی حافظ خیرالدین مرحوم و مغفور کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلق و نسبت کا باعث بھی یہی محبّت و شفقت تھی۔

فیصل آباد پہنچنا اور واپسی حافظ صاحبؒ اس مدرسے میں تقریباً تین سال تک زیرِ تعلیم رہے؛ اس اثنا میں ان کا یہاں کے ماحول کی یکسانیت سے دل اچاٹ ہو گیا تو وہ اپنے چند دوستوں کے ہمراہ فیصل آباد (سابق لائلپور) پہنچ گئے اور وہاں کسی مدرسہ میں داخلہ بھی حاصل کر لیا، مگر میاں جی احمد علی صاحب کو پتہ چلا تو وہ انھیں دوبارہ لاہور لے آئے۔ فیصل آباد میں تقریباً ایک مہینہ قیام رہا۔

حفظِ قرآن کی تکمیل اور سندِ فراغت عین اس وقت جب پاکستان کے طول و عرض میں تحریکِ ختمِ نبوّت پورے زوروں پر تھی، خداوند تعالیٰ نے حافظ صاحب کی محنت اور والدین کی نیک دعاؤں کو قبول کر لیا اور حافظ صاحب نے اگست ۱۹۵۳ء میں قرآن مجید حفظ کر کے اپنی اور اپنے والدین کی اُخروی سعادت کا ذخیرہ فراہم کر لیا۔ اس موقع پر حافظ صاحب کو مدرسہ کاشف العلوم سے جو سند جاری کی گئی، اس کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شهادة حفظ القرآن الكريم

الحمد لله الذی اورثنا کتابهٗ وحافظ علینا حروفهٗ واٰدابهٗ واغنانا فی حفظ القرآن لتواتر الطبقة عن الاسناد والصلوٰة والسّلام علیٰ سیّدنا محمّدٍ (صلی الله علیه وسلم) الّذی نزّل علیه الوحی والکتاب وعلیٰ اٰله وصحبهٖ اجمعین۔ امّابعد فانّا نشهد انّ

الطالب حافظ محمّد یٰس کرنالوی بن صوفی احمد علی صاحب المتوطن باکستان ضلع شیخوپورہ من بلاد کوٹ پنڈیداس قد اتم حفظ القرآن الکریم فی ھٰذہٖ المدرسۃ کاشف العلوم بلال پارک باغبانپورہ لاہور سنۃ الموافق اگست ۱۹۵۳ء وبناءً علیٰ ذالک نعطیہ ھٰذہٖ الشھادۃ وَھُوَ عندنا حُسن السیّر والسلوک ونوصیہ بتقویٰ اللہ تعالیٰ فی السرّ والعلانیۃ وبالمداومۃ علیٰ تلاوۃ القرآن الکریم اٰناء الیّل واٰناء النھار والعمل بمقتضاہٗ راغبًا فیما عند اللہ من الاجرِ والثواب سائلین المولیٰ عزّ وجلّ ان یُوَفّقَہٗ للقیام بواجبہٖ تلاوۃً ودرسًا وتدریسًا انّہٗ نعم المولیٰ ونعم النصیر وصلی اللہ علیٰ سیّدنا محمّد صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

توقیع المدیر	ختم المدرسہ	توقیع المدرس
		صدر مدرس واستاد قاری محمد صدیق

پہلا مصلّیٰ فراغت کے بعد حافظ صاحب نے پہلا مصلّیٰ حاجی محمد ارشد صاحب کی کوٹھی (لاہور) میں سنایا خود حاجی صاحب، جو حافظ قرآن بھی تھے، حافظ صاحبؒ کے اوّلین "سامع" بنے۔

حافظ صاحبؒ فراغت کے باوجود آخر وقت تک اپنے دونوں اساتذہ قاری محمد صدیق اور حافظ خیر الدّین کا اسی طرح ادب واحترام کرتے رہے۔ دونوں کے ساتھ ان کے نہایت خوشگوار مراسم آخر وقت تک قائم رہے۔

اعلیٰ تعلیم

مدرسہ احرار اسلام چاکیواڑہ - کراچی حافظ صاحب کے والدین کو، ان کے لختِ جگر کے حفظِ قرآن سے بے حد خوشی اور مسرت ہوئی؛ بھلا اس باپ کی خوشی کا کیا پوچھنا جو اپنے "نورِ چشم" کے "حفظِ قرآن" کے لیے بزرگوں سے دعائیں منگواتا پھرتا تھا۔ الغرض تعلیم کے اس ابتدائی مرحلے میں کامیابی پر خاندان بھر میں خوشیاں منائی گئیں۔

والدین کی اس زمانے میں سکونت بموضع گوٹھڑ بیلی ضلع سانگھڑ میں تھی، اس لیے خود والدین کو اور پھر حافظ صاحب کو لاہور آنے جانے میں سخت تکلیف ہوتی تھی؛ اسی دشواری کے پیشِ نظر حافظ صاحب کو کراچی میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا؛ چنانچہ انھیں [illegible]۵۴ء میں مدرسہ احرار اسلام چاکیواڑہ - کراچی - میں استاد مولانا محمد علی بلوچ کے پاس داخل کرا دیا گیا۔ یہاں حافظ صاحب دو سال کے قریب زیرِ تدریس رہے اور ابتدائی درسی کتب، غالباً فارسی نصاب، یہیں انھوں نے پڑھا، مولانا محمد علی بلوچ کے علاوہ مولانا فہیم خان بھی آپ کو پڑھاتے رہے۔

مدرسہ عربیہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ

چاکیوڑہ کے مذکورہ بالا مدرسے کا ماحول حافظ صاحب اور ان کے والدین کو چنداں پسند نہ تھا۔ اسی بنا پر ۱۹۵۶ء میں حافظ صاحب مدرسہ عربیہ اسلامیہ بنوری (سابقہ نیو) ٹاؤن میں بغرضِ حصولِ علم داخل ہو گئے، یہاں وہ "تقریباً دو سال (۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۷ء) زیرِ تعلیم رہے۔

مدرسہ عربیہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن مدرسہ عربیہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن وطنِ عزیز پاکستان کے نامور ترین اور اہم ترین مدارس عربیہ اسلامیہ میں سے ہے، اس مدرسہ کے بانی اور

اس کی روح رواں مولانا محمد یوسف بنوریؒ مرحوم ومغفور تھے ۔ مولانا بنوریؒ دارالعلوم دیوبند اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے ۔ انہوں نے ایک مدت تک حضرت علامہؒ کی خدمت میں رہ کر کسب فیض کیا تھا ، علامہ کشمیریؒ کے شاگردوں میں شاید ہی کسی شاگرد کو وہ عزت واحترام اور شہرت وناموری نصیب ہوئی ہو جو مولانا بنوریؒ کو حاصل ہوئی ۔

تقسیم ملک (اگست ۱۹۴۷ء) کے وقت وہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ ڈھابیل (سورت۔ گجرات ہند) میں مدرسِ اعلیٰ تھے۔ تقسیم ملک کے بعد نواح ۱۹۵۲ء میں پاکستان تشریف لائے اور مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہ یار (سندھ) میں بطور ایک استاد تعینات ہوگئے ۔ یہاں انہوں نے دو سال کے قریب تدریسی فرائض انجام دیے، مگر قدرت نے ان کی طبیعت میں جو علمی فیضان رکھا تھا ، اس کی توقع اس دور دراز شہر میں رکھنا عبث تھا ، اسی بنا پر ان کا دل جلد ہی ماحول سے اکتا گیا ۔ بالآخر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر توکلاً علی اللہ نیو ٹاؤن کراچی چلے آئے ، جو فی الوقت ان کے نام پر بنوری ٹاؤن کہلاتا ہے ۔ یہاں اس زمانے میں جامع مسجد زیر تعمیر تھی ۔ مولانا بنوریؒ نے اسی میں ڈیرہ ڈال دیا۔

بعد میں منتظمین کی اجازت سے انہوں نے ۱۹۵۴ء میں مشہور عالم مدرسے "مدرسہ عربیہ اسلامیہ" کی بنیاد واساس رکھی ، یہ ابتدائی زمانہ مولانا بنوریؒ اور دیگر اساتذۂ مدرسہ کے لیے سخت ابتلاء وآزمائش کا زمانہ تھا ۔ تنخواہ کی قسم کی کوئی چیز مقرر نہ تھی ۔ ابتدائی سال کے کئی مہینوں تک مولانا بنوریؒ اور ان کے ساتھی اساتذہ اعزازی طور پر پڑھاتے رہے ۔ مگر جلد ہی حالات بدل گئے اور مدرسہ کی "وافر آمدنی" کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

مولانا بنوریؒ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے مالی معاملات میں بڑے محتاط واقع ہوئے تھے ۔ اسی بنا پر انھوں نے مدرسہ میں دو علیحدہ علیحدہ کھاتے کھول رکھے تھے : زکوٰۃ فنڈ صرف اور صرف طلبہ کے لیے مختص تھا ، جبکہ غیر زکوٰۃ فنڈ میں سے اساتذہ کے مشاہرات

اور تعمیری کام بھی انجام پاتے تھے۔ طلبہ کو اس مدرسہ میں کھانے کے بجائے "نقد وظیفہ" ملتا تھا، جو وہ اپنے اپنے حسابات میں، ناظم مطبخ کے پاس جمع کرا دیتے تھے، جہاں سے انہیں اس کے بدلے دو وقتہ کھانا ملتا تھا[۱]

جس سال حافظ صاحبؒ نے جاکیواڑہ کے مدرسہ احرار اسلام میں داخلہ لیا (۱۲۷۴ھ ۱۹۵۴ء)، اسی سال مولانا بنوریؒ نے مدرسہ عربیہ اسلامیہ کا آغاز و افتتاح فرمایا۔ جس سال حافظ صاحب یہاں پڑھنے کے لیے تشریف لائے تو اس وقت بھی مدرسے کی عمارات خصوصاً دارالاقامہ زیر تعمیر تھیں۔ تعمیری اخراجات کی بنا پر طلبہ کو ان دنوں ابتلاؤ آزمائش کے مراحل سے گذرنا پڑ رہا تھا، حافظ صاحب نے ان تمام مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اپنی تعلیم مکمل کرنے میں بدل وجان مشغول رہے۔

حافظ صاحبؒ کی یہ عین سعادت تھی کہ انہیں پاکستان کی اس عظیم الشان اسلامی درسگاہ میں پڑھنے کا اس وقت موقع فراہم ہوا، جب اس کی بنیادیں استوار کی جا رہی تھیں، اس بنا پر وہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کی ابتدائی تاریخ پر بڑی مفید معلومات رکھتے تھے۔ یہاں حافظ صاحبؒ نے حسبِ ذیل اساتذہ کرام سے کسب فیض کیا۔

۱۔ حضرت مولانا عبد الجلیل صاحب

۲۔ حضرت مولانا خان محمد صاحب

۳۔ حضرت مولانا عبید الرحمٰن کیملپوری صاحب

۴۔ مولانا قاری عبد الحق صاحب

۵۔ استاد محمد یوسف عطیہ مصری صاحب اور

۶۔ حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی صاحب

---

[۱] دیکھیے بینات کا مولانا بنوری نمبر۔ یہ تمام معلومات اسی سے ماخوذ ہیں۔

ان اساتذہ میں سے بعض اساتذہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور نہایت جید عالم و فاضل اشخاص تھے حافظ صاحبؒ نے اپنی شخصیت کی تکمیل کا پہلا مرحلہ یہیں مکمل کیا تھا۔

یہاں گو انہوں نے ابتدائی تین سالوں (اولیٰ تا ثالثہ) کی تعلیم حاصل کی تھی، مگر جنھوں نے یہاں حافظ صاحب کو، پڑھتے ہوئے دیکھا وہ ان کے اخلاق عالیہ سے بے حد متاثر ہوئے حافظ صاحب کے ہونے والے سسر حاجی محمدؒ رمضان صاحب نے اسی زمانے میں حافظ صاحب کو دیکھا تھا اور وہ ان کے علم و اخلاق دونوں سے بید متاثر ہوئے تھے۔ یہ سب آپ کے اساتذہ کا فیضانِ صحبت تھا۔

دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈوالہ یار

۱۹۵۸ء میں حافظ صاحب ٹنڈو الہ یار کے مشہور مدرسہ "مدرسہ دارالعلوم اسلامیہ" میں چلے آئے۔ جو اس زمانے میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی نسبت سے خصوصی شہرت و انفرادیت کا حامل تھا۔

حیدرآباد (سندھ) سے سندھ کے اندرونی علاقوں کی طرف بہت سی برانچ لائنیں ( ) جاتی ہیں۔ انہی میں سے ایک برانچ لائن میرپور خاص کی طرف جاتی ہے، اسی پر ٹنڈو الہ یار کا شہر واقع ہے۔ اسی ٹنڈو الہ یار شہر کو دارالعلوم اسلامیہ کی تعمیر و ترقی کا شرف حاصل ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد شہر ٹنڈو الہ یار کو بہت ترقی ملی ہے۔ فی الوقت یہ تحصیل کا صدر مقام اور ریلوے و سڑک کے ذریعے ملک کے باقی حصوں کے ساتھ مربوط ہے۔

مدرسہ دارالعلوم کی تاسیس تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کے بہت سے نامور علماء و فضلا ترک وطن کر کے پاکستان میں چلے آئے تھے۔ یہاں ان حضرات نے وطن عزیز پاکستان

کے تمام بڑے اور اہم مدارس کی تشکیل و تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔

لاہور میں مفتی محمد حسنؒ کا قائم کردہ "جامعہ اشرفیہ"، مولانا حامد میاں کا بنا کردہ "جامعہ مدنیہ"، ساہیوال کا جامعہ رشیدیہ، ملتان کا مدرسہ قاسم العلوم، خیر المدارس، کبیروالہ کا "دارالعلوم" گوجرانوالہ کا مدرسہ نصرت العلوم، کراچی کا "مدرسہ عربیہ اسلامیہ"، بنوری ٹاؤن، مفتی محمد شفیع کی نگرانی میں قائم کردہ مدرسہ دارالعلوم اور ٹنڈو الہ یار کا زیر نظر مدرسہ اس سلسلے کی معروف ترین مثالیں ہیں۔

دارالعلوم اسلامیہ، ٹنڈو الہ یار کا مدرسہ اگرچہ کافی عرصے سے قائم تھا، مگر اس کو شہرت و ناموری اس وقت نصیب ہوئی جب مدرسہ کے مہتمم مولانا احتشام الحق تھانوی" شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانیؒ" کو خصوصی دعوت پر مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) سے یہاں بلا لائے۔ ان کی آمد سے اس مدرسے کی شہرت میں کئی گنا اضافہ ہوا۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ (م ۱۳۹۴ھ / ۱۹۷۴ء) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حقیقی بھانجے، ان کے ہم زلف، خصوصی شاگرد و مرید اور مسلک علمائے دیوبند کے اہم ترین اور ثقہ ترین بزرگوں میں سے تھے۔ ان کی عربی کتاب اعلاء السنن خود عربوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ وہ مولانا تھانویؒ کی ہدایت پر قیام پاکستان کی مسلم لیگی تحریک کے ہراول دستہ میں شامل رہے، خود بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خان ان کی مجاہدانہ کوششوں کے معترف تھے۔ انہوں نے کئی بار حکومت کی خواہش پر بیرونی ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ الغرض وہ بہت سی خصوصیات کے جامع بزرگ تھے۔

حافظ صاحب کا دارالعلوم الاسلامیہ میں داخلہ

الغرض ان کی ٹنڈو الہ یار آمد سے دارالعلوم الاسلامیہ کو "حیات نو" ملی اور طالب علم جوق در جوق ادھر کا رخ کرنے لگے۔ حافظ صاحب بھی اس شہرت سے متاثر ہوئے اور اپنے

چند ہم سبق ساتھیوں سمیت ۱۳۷۹ھ / ۱۹۵۸ء میں یہاں چلے آئے اور پھر ایسے آئے کہ پھر دستار فضیلت اور سند فراغت لے کر ہی یہاں سے گئے۔ یہاں انہوں نے اپنی تعلیمی زندگی کے آخری اور اہم ترین پانچ سال نہایت یکسوئی کے ساتھ بسر کیے۔ جس کے اثرات عظیم الشان کی سیرت و کردار میں جھلکتے رہے۔ حافظ صاحب کے زمانۂ تعلیم میں حافظ صاحب نے خصوصی طور پر مندرجہ ذیل اساتذہ سے کسب فیض کیا:

۱۔ شیخ الحدیث، مولانا ظفر احمد عثمانی، قدس سرہٗ (م ۱۹۷۴ء)

۲۔ نائب شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی، مدظلہٗ حال شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور۔

۳۔ استاد حدیث مولانا محمد جمشید صاحب۔ حال مقیم مرکز تبلیغ رائیونڈ، ضلع لاہور۔

۴۔ استاد الحدیث مولانا مفتی محمد وجیہ صاحب۔

۵۔ مولانا پروفیسر محبوب الٰہی صاحب۔

۶۔ مولانا الطاف الرحمٰن صاحب۔

۷۔ مولانا عابد الرحمٰن صاحب۔

ان میں سے اوّل الذکر چاروں اساتذہ سے حافظ صاحب کا خصوصی تعلقِ تلمذ تھا، بالخصوص مولانا ظفر احمد عثمانی سے حافظ صاحب بہت زیادہ مستفید و مستفیض ہوئے۔ ان اساتذہ کے حافظ صاحب کے نام خطوط سے اساتذہ کی جانب سے بھی حافظ صاحب سے خصوصی تعلق و نسبت کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے چند خطوط کا ذکر آگے آتا ہے۔

دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں پڑھی ہوئی کتب

ٹنڈو الہ یار میں حافظ صاحبؒ نے اپنے چھ سالہ طویل قیام میں حسبِ ذیل کتابیں پڑھیں:

ا۔ علم الحدیث

۱۔ صحیح بخاری؛ ۲۔ صحیح مسلم؛ ۳۔ جامع السنن لابی عیسٰی الترمذی مع الشمائل الترمذی؛

۴ ۔ جامع السنن لابی داؤد السجستانی ؛ ۵ ۔ سنن النسائی لابی عبد الرحمٰن النسائی ؛ ۶ ۔ سنن ابن ابی ماجہ لامام ابن ماجہ القزوینی ؛ ۷ ۔ شرح المعانی الآثار لامام ابی جعفر الطحاوی ؛ ۸ ۔ الموطا لامام مالک ؛ ۹ ۔ الموطا لامام محمد بن الحسن الشیبانی ؛ ۱۰ ۔ مشکوٰۃ المصابیح ۔

ب ۔ علم تفسیر قرآن ؛

ا ۔ تفسیر جلالین لِلامام السیوطی والمحلّی ۔

ج ۔ علم اصول حدیث ؛

ا ۔ نخبۃ الفکر لِلامام ابن حجر العسقلانی ۔

د ۔ علم تصوّف ؛

ا ۔ حجۃ اللہ البالغۃ لِلامام شاہ ولی اللہ محدث دھلویؒ ۔

ھ ۔ علم فقہ ؛

ا ۔ ہدایہ کامل لِلامام ابی الحسن المرغینانی ؛ ۲ ۔ شرح الوقایہ ؛ ۳ ۔ کنز الدقائق ؛

و ۔ اصول فقہ ؛

ا ۔ نور الانوار ؛ ۲ ۔ الحسامی ؛ ۳ ۔ اصول الشاشی ؛

ز ۔ علم المعانی والبیان والبدیع ؛

ا ۔ مختصر المعانی ؛

ح ۔ علم الکلام ؛

ا ۔ شرح العقائد ؛

ط ۔ علم المیراث والفرائض ؛

ا ۔ السراجی ؛

ی ۔ علم الادب ؛

ا ۔ مقامات حریری ، لابی قاسم الحریری ؛ ۲ ۔ نفحۃ العرب ؛

ک - علم النحو :

۱- الکافیہ لابن الحاجب ؛ ۲ - شرح الجامی ، لملّا جامی ؛

ل - علم المنطق :

۱- القطبی ؛ ۲ - شرح التہذیب ؛ مرقات ؛

کتابوں کی اس فہرست میں علم فقہ، علم منطق، علم صرف، علم ادب اور علم فلسفہ کی ابتدائی کتابیں اور فارسی نصاب شامل نہیں ہے، کیونکہ یہ کتابیں اور فارسی نصاب حافظ صاحب چاکی واڑہ کے مدرسہ احرار اسلام اور بنوری ٹاؤن کے مدرسہ عربیہ اسلامیہ میں ازیں قبل پڑھ چکے تھے۔

فراغت اور سند فراغت

بالآخر حافظ صاحب اپنے والدین کی نیک تمناؤں اور اپنی محنت وکاوش اور فضلِ خداوندی سے شعبان ۱۳۸۳ھ / دسمبر ۱۹۶۳ء میں درس نظامی سے فارغ ہو گئے۔ مذکورہ تاریخ کو حافظ صاحب اور انکے ساتھیوں نے ختم بخاری کی سعادت حاصل کی۔ پھر اسی مہینے میں سالانہ امتحان میں شریک ہوئے، کامیابی سے ہمکنار ہونے کے باعث انہیں ۲۰ ذوالحجہ ۱۳۸۳ھ کو سند فراغت دی گئی، جس کی عبارت حسب ذیل ہے :

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سند الفراغ من دار العلوم الاسلامیہ

ٹنڈو والہ یار الباکستان

الحمد للہ الذی جل ذکرہٗ وعزّت اسمائہ وتعالت نعوتہٗ وصفاتہٗ وحدثت بربوبیتہٖ ارضہٗ وسماؤہٗ وتسلسلت آلاؤہٗ وتواترت نعمائہٗ اشھد ان لآ الٰہ

اِلّا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ واشہدان سیّدناومولانا محمّدًا
عبدہٗ ورسُولہٗ خاتمُ الانبیاء والمرسلین والمبعوث
رحمۃً للعٰلمین فیا ربّ صلّ وسلّم علیہ وعلیٰ اٰلہٖ
واصحابہٖ الشاھدین بسننہٖ وایّامہٖ والمتّبعین لِسنتہٖ
وھدائہٖ واحکامہ والتابعین لھم باحسان ومن تبعھم
الیٰ یوم الدین فی کلّ اٰن وحین امّا بعد فان القرآن
العظیم ھُدًی وشفاءٌ والسنۃ النبویۃ نورٌ وضیاءٌ
اصلح اللہ بھما امّۃ عوجًا وفتح بھما ینابیع الرشدو
الھدایۃ فی سائر الارجاء وبھما فتح اللہ قلوبًا غلفًا
واٰذانًا صُمّا وعیونًا عمیًا فلاشک انھما روح ھٰذہٖ
العالم وقوام ھٰذہٖ الدنیا وانّ العلوم الدینیہ التّی
ھی تکشف النقاب عن وجوہ خرائد الکتاب والسنۃ
وبھما تفتح افضال الشرائع الالھیّۃ وحقًّا انھما مفاتیح
الجنۃ وفق اللہ لامۃ المحمدیۃ بخدمتھا العلیہ
وتستعد فی سبیلھا لکلّ تفدیۃٍ وانّ اخانا فی اللہ
المولوی الحافظ محمد یٰس بن احمدعلی صاحب
کرنالوی کوٹ پنڈی داس ضلع شیخوپورہ پنجاب قد
دخل ھٰذہ الجامعہ الدینیّہ دارالعلوم الاسلامیہ
۱۳۷۹ھ ومکث بھا متعلّمًا سنۃ ۱۳۸۳ھ فلما فرغ
وفاذ فی الامتحان النھائی اعطیناہٗ ھٰذہٖ الشھادۃ من
الجامعۃ ونوصیہٗ وایّانا بتقوی اللہ عزّ وجل فی السرّو

العلانیة والاعتصام بالکتاب والسنة والاستقامة علیٰ
عقائد اھل السنة والجماعة والتزام تقلید احدٍ
من الائمة الاربعة ونوصیہ بحسن التأدب بحضرۃ
السلف الصالحین و سائر علماء الدّین نلتمس منہٗ
ان لاینسانا فی صالحِ دعواتہٗ فی خلواتہٗ وجلواتہٖ سبحان
ربّك ربّ العزّة عما یصفونَ وسلام علی المرسلین۔
والحمد للہ ربّ العٰلمین

اسامی الکتب المقروۃ بدار العلوم الاسلامیہ
احتشام الحق تھانوی ظفر احمد عثمانی عفا عنہ۔ محمد مالک کاندھلوی
عفر اللہ لہٗ، محمد وجیہ غفرلہٗ عابد الرحمان عفی عنہ۔

دفتر
دار العلوم الاسلامیہ

یوں تو اس مدرسے کے تمام اساتذہ سے حافظ صاحب نے استفادہ فرمایا، مگر ان میں سے سب سے زیادہ متأثر وہ مولانا ظفر احمد عثمانی سے ہوئے۔ چنانچہ تذکرۃ الظفر میں حافظ صاحب کو حضرت مولانا کے خصوصی شاگردوں میں شمار کیا گیا ہے۔[1]

اکتسابِ طریقت

اسلاف کے یہاں ہمیشہ یہ دستور رہا کہ وہ ظاہری علومِ (شریعت) کے حصول کے بعد علومِ باطنی (طریقت و احسان) کی تحصیل میں لگ جاتے تھے اور اس وقت تک کوئی

---

[1] تذکرہ الظفر، مطبوعہ کمالیہ، ص ۱۵۸۔

عالم" مستند عالم" نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک وہ کسی مرشد کامل کی خدمت میں رہ کر باقاعدہ اکتساب طریقت نہ کرلیتا تھا، مولانا رومؒ اسی مضمون کو یوں بیان فرماتے ہیں:

مولوی ہرگز نشد مولائے روم تا غلامے شمس تبریزے نشد

(جب تک میں نے شمس تبریزی کی غلامی اختیار نہ کی، میں مولوی نہیں ہوا)

اکثر علمائے ہند، مثلاً حضرت مجدد الف ثانیؒ، خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ، مرزا مظہر جان جاناں، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ، شاہ غلام علی دھلویؒ، امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دھلویؒ، شاہ عبدالعزیز دھلویؒ، سید احمد شہید بریلویؒ، قطب العالم حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ وغیرہ حضرات نے اسی طریقے پر اپنی علمی تکمیل فرمائی تھی۔ خود حافظ صاحب کے استاد و مربی مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے بھی اسی طرز پر مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاں باقاعدہ مراحلِ سلوک طے کرکے "مسند حدیث" کو زینت دی تھی، بہرحال حافظ صاحب اکتساب طریقت کے لیے حسبِ ذیل خانقاہوں سے منسلک رہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ، امیر تبلیغی جماعت

حضرت مولانا محمد یوسف دھلویؒ، شیخ کامل مولانا محمد الیاس دھلویؒ (م ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) کے فرزند ارجمند، ان کے خلیفہ اور ان کے جانشین تھے۔ مولانا محمد یوسف دہلویؒ جنہیں تبلیغی جماعت کے لوگ احتراماً "حضرت جی" کہتے تھے، بہترین مقرر اور خوش بیان خطیب بھی تھے، ان کے وعظ سے ایک سماں بندھ جاتا تھا، تبلیغی جماعت کا کام انہی کی کوششوں سے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا۔

مولانا محمد یوسف دھلویؒ اپنے والد سے مجاز تھے، جنھیں فیضِ تربیت دو کاملین،

یعنی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے حاصل ہوا تھا، طرح طریقت کی یہ شاخ سلسلۂ چشتیہ کی معروف شاخ ہے، جس کے فیوض واثرات ہندوستان میں سب سے زیادہ ہیں۔

حافظ صاحبؒ تبلیغی جماعت سے "دورِ طالب علمی" سے ہی متاثر تھے۔ اوپر گذر چکا ہے کہ انہوں نے پاکستان میں آتے ہی اپنے والد گرامی کے ساتھ تین چلے لگائے تھے۔ فراغت کے بعد تو یہ تأثر اور بھی بڑھا، اسی لیے اپنے مرشد روحانی کے طور پر ان کی نگاہِ انتخاب کا حقدار مولانا محمد یوسف دہلویؒ سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا۔ غالباً رائیونڈ کے سالانہ تبلیغی اجتماع یا بلال پارک کے کسی اجتماع میں حافظ صاحب "حضرت جیؒ" سے بیعت ہوئے۔ حضرت جی ایسے موقعوں پر "عام بیعت" کیا کرتے تھے، جس میں بیک وقت کئی کئی سو افراد شامل ہوتے تھے؛ اس سے زیادہ خصوصی تعلق کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ حضرت جیؒ سے بیعت کا زمانہ ۱۹۶۳ سے ۱۹۶۶ء کے مابین متصور ہوتا ہے۔

حضرتِ مولانا ظفر احمد عثمانی، شیخ الحدیث

حافظ صاحب کے دوسرے مرشد کامل شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ تھے۔ جو بذاتِ خود ایک کامل الفن شخصیت کے مالک تھے۔

مولانا عثمانی ۱۳ ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء کو اپنے جدی مکان واقع دیوبند میں پیدا ہوئے۔ اڑھائی سال کی عمر تھی کہ والدہ صاحبہ (جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہمشیرہ تھیں) انتقال کر گئیں، اسی بنا پر ان کی ابتدائی پرورش ان کی دادی صاحبہ نے کی۔ بڑے ہو کر دار العلوم دیوبند، امداد العلوم تھانہ بھون اور جامع العلوم کانپور میں درسی علوم پڑھے۔ فراغت کے بعد مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے بیعت کی۔ مگر مراحل سلوک تمام تر مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تفصیلاً طے کیے۔ خلافت بھی انہی کی طرف سے

ملی، اس لحاظ سے طریقت کا یہ سلسلہ بھی سابق سلسلے کی طرح چشتی سلسلہ ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی بہت سی نادر کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی شہرۂ آفاق تصنیف اعلاء السنن، عربوں کے ہاں بھی درجۂ قبولیت حاصل کر چکی ہے۔ وہ تحریک پاکستان میں علمائے دیوبند کی نمائندگی کرتے رہے۔ مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے محدثانہ خدمات ادا کرتے ہوئے ۲۳ ذوالقعدہ ۱۳۹۴ھ/۸ دسمبر ۱۹۷۴ء کو کراچی میں انتقال فرمایا، انہیں پاپوش نگر قبرستان کراچی میں دفن کیا گیا۔[۱]

ہمارے مخدوم حافظ صاحب کے مولانا عثمانیؒ سے زمانۂ طالب علمی ہی میں خصوصی تعلقات قائم تھے۔ حافظ صاحب اپنے اساتذہ میں سے سب سے زیادہ انھیں سے مرعوب و متاثر تھے، مگر اس زمانے میں بیعت ہونے کا خیال ان کے دل میں پیدا نہ ہوا۔

جب غالباً ۱۹۶۶ء میں مولانا محمد یوسف دھلویؒ حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے، تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا، اس موقع پر انھیں استاد گرامی کا خیال آیا جو اس کام کے لیے بے حد موزوں تھے۔

ادھر مجبوری یہ تھی کہ مولانا عثمانیؒ کا مستقل قیام ٹنڈو الہ یار میں ہی رہتا تھا اور ادھر اُدھر آنا جانا انہوں نے موقوف کر رکھا تھا، اب حافظ صاحب ان سے بیعت ہوں تو کیسے ہوں؟ اس مشکل کا حل "خط و کتابت" کے ذریعے حافظ صاحب نے تلاش کر لیا۔

اہل تصوف میں خط و کتابت کے ذریعے بیعت ہونے کا سلسلہ کچھ زیادہ نہیں ملتا۔ تاہم تھانوی بزرگوں کے ہاں اس کی وسعت نسبتہً زیادہ ہے۔

اس مقصد کے لیے حافظ صاحبؒ نے اپنے استاد و مربی اور پیر و مرشد مولانا عثمانی کو ایک خط لکھا، یہ خط جوابی تھا، جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ حافظ صاحب

---

[۱] عبدالشکور: تذکرہ الظفر، مطبوعہ کبالیہ ۱۹۷۷ء

کو اپنی بیعت میں لے لیں، اس کا جواب مولانا عثمانی نے یہ دیا:

عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

توکلاً علی اللہ آپ کو خط سے بیعت کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت فرمائے۔ کہیں ملاقات کا اتفاق ہوگیا تو دست بدست بھی بیعت ہو جائے گی۔ اب اپنے معمولات سے اطلاع دیجئے اور تعلیم الدین مؤلفہ حضرت حکیم الامۃ کا مطالعہ کر کے امراضِ قلب کو پہچانیے۔ جس مرض کا غلبہ ہو اس سے اطلاع دیجئے۔ اور جو علاج تبلایا جائے اس پر عمل کیجئے حضرت حکیم الامتؒ کے مواعظ وملفوظات جس قدر آسانی سے مل جائیں حاصل کر کے مطالعہ کیجئے۔

والسلام ظفر احمد عثمانی عفی عنہ

۶ محرم ۱۳۸۵ھ۔

اس طرح حافظ صاحب باقاعدہ تھانوی اور سہارنپوری سلسلہ میں بیعت ہو کر اس زمرہ میں باقاعدہ شامل ہو گئے اور کسبِ طریقت کا سلسلہ شروع کر دیا جو مولانا عثمانیؒ کی وفات تک جاری رہا۔ اس ضمن میں حافظ صاحب اور مولانا عثمانیؒ کے مابین خط وکتابت ہوتی رہی۔ چنانچہ مولانا عثمانیؒ کے حافظ صاحب کے نام تین خطوط (بشمول مذکورہ بالا) ملتے ہیں۔ یہ تینوں خطوط اسی عنوان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حافظ صاحب نے بیعت ہو جانے کے بعد، مولانا عثمانیؒ کو دوسرا خط لکھا جس میں جوابی خط کے طور پر حافظ صاحب نے ائرمیل لفافہ ڈال دیا تھا، اس پر مولانا عثمانیؒ نے تحریر فرمایا:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

لفافہ بجای ائرمیل کے دوسرا عام لفافہ بھیجو تاکہ آپ کا خط اور جواب

دونوں محفوظ رہیں اور ہر صفحہ کا آدھا کالم بائیں طرف جواب کے لیے خالی رکھو، تو سوال وجواب دونوں ساتھ ہونگے۔ اس میں آسانی ہے۔
معمولات مناسب ہیں۔ ان میں تلاوت قرآن اور ایک منزل مناجات مقبول کا اور ذکر بارہ تسبیح کا اضافہ کرلیا جائے۔ ذکر بارہ تسبیح کی ترکیب قصد السبیل سے معلوم کرلی جائے والسلام

ظفر احمد عثمانی عفی عنہ

۲ر ربیع الاول ۱۳۸۵ھ

اس خط میں مولانا عثمانیؒ نے حافظ صاحب کو جو ہدایات دی ہیں، حافظ صاحبؒ نے ان کے مطابق اپنے پیر و مرشد کو ایک اور خط ارسال کیا اس کا مضمون حسب ذیل ہے:

حافظ محمد لیس کرنالوی — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	۱۷ر جمادی الثانی ۱۳۹۳ھ حوالہ نمبر ۲۲۳/۹۲
سیدی واستادی حضرۃ مولانا شیخ الاسلام صاحب العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہونگے۔	حضرت مولانا عثمانی کا جواب وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ بحمد اللہ اچھا ہوں
کافی مدت سے کوئی عریضہ ارسال نہ کرسکا اس غفلت کی معافی کا طلبگار ہوں۔ عرض یہ ہے کہ نیک اعمال سے دل چور ہوتا جارہا ہے سُستی بہت ہی بڑھ چکی ہے حافظہ دن بدن کمزور ہوتا دکھائی دیتا ہے دل دنیا کی اسکیمیں بناتا رہتا ہے۔ حسب ذیل کتب اکثر زیر مطالعہ رہتی ہیں: تفسیر عثمانی، تفسیر مظہری، مکتوبات مجدد الف ثانی،	سب معاف ہے۔ سُستی کا علاج چستی ہے ہمت کرکے کام کیا کرو بادام کھایا کرو

تبلیغی نصاب مکمل مواعظ حضرت تھانویؒ۔ معمولات مدرسہ سے مسجد یا اپنا حجرہ۔ خود پسندی بہت بڑھتی جا رہی ہے۔ خدا بچائے۔ اُمید ہے کہ اس روحانی مریض کی دوا ارسال فرمائیں گے۔

آپ کا نالائق شاگرد العبد محمد الیس کرنالوی

ذکر بارہ تسبیح کی پابندی کرو۔ اس کا طریقہ حضرت تھانویؒ کے رسالہ قصد السبیل میں مذکور ہے۔

والسلام ظفر احمد عثمانی۔

حافظ صاحب کے مجموعہ خطوط میں پیر و مرید کے مابین لکھا جانے والا یہ آخری مکتوب ہے۔ اس سے اگلے سال مولانا عثمانیؒ کی وفات ہوگئی۔

شیخ الحدیث مولانا محمدؒ زکریا کاندھلوی سے بیعت

جب ذوالقعدہ ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء کو مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی بھی وفات ہوگئی، تو حافظ صاحب ایک مرتبہ پھر بے سایہ ہوگئے۔ اس مرتبہ ان کی نظرِ انتخاب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ پر پڑی، جو بلاشبہ یادگارِ اسلاف تھے۔

شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ، حضرت مولانا محمد یحییٰؒ (مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے بڑے بھائی) کے صاحبزادے تھے۔ مولانا یحییٰ صاحبؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خادمِ خاص اور خصوصی فیضِ تربیت یافتہ تھے۔ مولانا یحییٰ صاحبؒ نے عین عالمِ شباب میں ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۷ء میں انتقال فرمایا۔ اس وقت شیخ الحدیث ابھی بچے ہی تھے، مگر خدا تعالیٰ نے انہیں جس سعادت سے بہرہ اندوز کیا تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ "داغِ یتیمی" کے باوجود تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری رکھا اور پھر وہ مقام حاصل کیا۔ کہ بلاشبہ وہ اپنے زمانے کے "یادگارِ اسلاف" بن گئے۔

شیخ الحدیث صاحبؒ تبلیغی جماعت کے سرپرست بھی تھے، تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماعات میں باقاعدگی کے ساتھ ہر ملک میں شریک ہوتے تھے، پاکستان میں اپنی وفات تک ان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کا سلسلۂ طریقت بھی "چشتی" تھا، اسی لیے حافظ صاحب نے انہی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہونا پسند کیا۔ ۱۹۷۴ء کے بعد کسی سالانہ اجتماع میں حافظ صاحب ان کے ہاتھوں پر بیعت ہو گئے، اور اپنی وفات تک انہی کے دامن سے وابستہ رہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ سے حافظ صاحب کے خصوصی تعلق کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

حافظ صاحب کے اپنے اساتذہ سے تعلقات

مشہور قول ہے کہ "ماں باپ بچے کو آسمان سے نیچے لاتے ہیں اور استاد تعلیم و نیک ترتیب کے ذریعے بچوں کو دوبارہ آسمان پر لے جاتا ہے" اسی بنا پر اسلام میں ماں باپ کی طرح استاد کے ادب و احترام کا بھی خصوصی حکم دیا گیا ہے۔

حافظ محمد لیس صاحب کرنالویؒ اگرچہ ۱۹۶۳ء میں دینی و مذہبی تعلیم سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے اساتذہ کے "حلقۂ اثر" سے باہر آ گئے تھے۔ مگر انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سانس تک اپنے استادوں کے ساتھ تعلق قائم رکھا۔ حافظ صاحب نے جن اساتذہ سے قرآن مجید حفظ کیا تھا، ان اساتذہ یعنی حافظ خیر الدین اور قاری محمد صدیق صاحب کا آخر وقت تک حد درجہ ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ یہ دونوں اساتذہ ان کے پاس اکثر کوٹ پنڈی داس تشریف لاتے اور حافظ صاحب بھی بہت کثرت کے ساتھ ان کے پاس بلال پارک حاضر ہوتے رہتے تھے اپنے جملہ معاملات میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

درجۂ علیا کے اساتذہ میں سے شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا محمد مالک کاندھلوی اور مولانا محمد جمشید صاحب کے ساتھ آخر وقت تک پُرخلوص تعلقات قائم رہے مولانا جمشید صاحب تو اکثر کوٹ پنڈی داس حافظ صاحب کے ہاں تشریف لاتے رہتے تھے اور حافظ صاحب بھی رائیونڈ میں ان سے ملاقات رکھتے تھے۔ دیگر دونوں اساتذہ

سے قلبی تعلق آخر وقت تک قائم رہا۔

۹۔ سند طبابت بہت کم لوگوں کے علم میں یہ بات ہوگی کہ حافظ محمد لئیں صاحب ایک مستند اور سند یافتہ حکیم اور طبیب بھی تھے۔ انہوں نے ادارۂ طبیہ سوہدرہ پاکستان سے سے طبی سند حاصل کی تھی اور اس ادارے میں باقاعدہ طبابت کا کورس مکمل کیا تھا۔

پرانے علماء کے ہاں عام طور پر یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ دینی علوم کیساتھ ساتھ طبی علوم میں بھی ماہر ہوتے تھے۔ قریبی زمانے کے علماء میں سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کا نام پیش کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے علومِ دینیہ میں مہارت تامّہ رکھنے کے ساتھ طبی علوم میں بھی مہارت تامّہ بہم پہنچائی تھی۔ اس علم کے حصول کے دو مقاصد ہوا کرتے تھے، اولاً عوام کو نفع پہنچانا اور ان کی خدمت کرنا۔ دوم اپنی جائز ضروریات کے لیے ایک کسبِ حلال کا طریقہ اپنانا۔

حافظ صاحبؒ نے بھی یہ فن اسی لیے سیکھا تھا، مگر انہیں اس سے استفادے کا زیادہ موقع نہ مل سکا، کیونکہ آپ نے ۱۹۷۹ء میں فراغت پائی تھی، جبکہ ۱۹۸۱ء میں ان کی وفات ہوگئی۔ بہرحال اس طبی ادارے سے جو سند حاصل ہوئی، اس کی عبارت حسب ذیل ہے:

ترجمہ:

ادارہ طبیہ سوہدرہ پاکستان

سند

برائے رکنیت یونانی میڈیکل ریسرچ انسٹیٹیوٹ

تصدیق کی جاتی ہے کہ حکیم حافظ محمد الیاس کرنالوی، خطیب جامع مسجد شاکر آباد (کوٹ پنڈیداس)، شیخوپورہ، ادارۂ طبیہ کے ایک مخلص رکن ہیں اور انہوں نے ہمارے ادارے میں مارچ ۱۹۷۹ء سے فکری و عملی تحقیقی کام بڑی دلچسپی سے کیا ہے اور عملی کام کے حصہ اوّل اور حصہ دوم میں تربیت پائی ہے۔

دستخط:

صدر ادارہ طبیہ سوہدرہ پاکستان　　　　نمبر ۳۸۸۸

باب سوم

مشاغلِ حیات

حصولِ روزگار حافظ صاحبؒ کو قدرت نے بچپن سے کچھ خوبیاں ایسی دی تھیں کہ جو کوئی ان کو دیکھتا یا ان کی باتیں سنتا تو وہ گرویدہ ہو جاتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے طبیعت کی یہ خصوصیت بھی نکھرتی چلی گئی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی زندگی سے فراغت کے بعد انھیں "حصول روزگار" میں زیادہ سرگرداں نہیں ہونا پڑا۔ بلکہ جیسے ہی انہوں نے دارالعلوم الاسلامیہ (ٹنڈو الہ یار) سے فراغت پائی مختلف اطراف سے انھیں دعوتی خطوط اور پیغامات ملنے شروع ہو گئے۔ اس ضمن میں مدرسہ عربیہ حسینیہ تعلیم القرآن شہداد پور کے مہتمم مولانا عبدالعزیز صاحب کے ایک گرامی نامے کا ذکر مناسب ہو گا جو انہوں نے اس موقع پر حافظ صاحب کو تحریر کیا تھا:

مکرمی زید عنایتکم السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بعد تسلیم کے گذارش یہ ہے کہ جناب صوفی احمد صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ تعلیم سے فارغ ہو گئے ہیں اور آئندہ کسی مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دینا چاہتے ہیں۔ تو یہاں قصبہ جھول میں ایک جگہ ہے اور بہت اچھی جگہ ہے۔ وہاں کے کارکن خوش عقیدہ اور اپنے ملنے والے ہیں۔ آپ کے لیے بہت مناسب جگہ ہے۔ اگر اس جگہ یہ خدمت کرنا چاہیں تو جناب حاجی محمد رمضان صاحب سے مشورہ کر کے مطلع کریں۔ آپ کے ذمّہ مسجد کی خطابت اور قرآن شریف کا درس ضروری ہو گا اور مکان وغیرہ

کی تمام سہولتیں ہونگی ۔ مگر آپ کے جواب آنے پر ہم ان سے گفتگو کرینگے
تنخواہ کی بابت بھی جواب آنے پر گفتگو ہوگی ۔ اس عریضہ کا جواب بہت
جلد ارسال کریں ۔ واقفین پرسان حال سے سلام کہہ دیں ۔

عبدالعزیز المرسل، مہتمم مدرسہ عربیہ حسینیہ تعلیم القرآن شہداد پور

یہ خط ۱۶ رجنوری ۱۹۶۴ء کو شہداد پور سے روانہ ہوا اور اسی مہینے میں حافظ صاحبؒ کو موصول ہوا ۔ گویا جنوری کے مہینے تک، حافظ صاحب نے ابھی اپنے مستقبل کا فیصلہ نہیں کیا تھا ؛ اس سے ایک مہینہ پہلے حافظ صاحب کے سُسر حاجی محمد رمضان نے بھی، حافظ صاحب کو ٹنڈو الہ یار خط ارسال کیا تھا، اس میں منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی تحریر تھا :

"شب برات سے پہلے آپ بستی پہنچ جائیں ۔ اسکے بعد ۲۰ شعبان کو آپ کوٹ پنڈی داس جلدی تشریف لادیں قرآن شریف آپ نے کوٹ پنڈی داس میں سنانا ہوگا ۔ وہیں سے آپ کے لیے آپ کی مرضی کے مطابق دینی خدمات کے متعلق کوئی جگہ تلاش کی جائے گی ۔ جو بھی بات مشورہ میں آئیگی اسی پر عمل ہوگا کیونکہ مشورہ میں خیر ہوتی ہے"

الغرض رمضان المبارک کے اختتام تک حافظ صاحب اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے، مگر جلد ہی انھیں یہ فیصلہ کرنا پڑا ۔

شاکر آباد (کوٹ پنڈیداس) میں خطابت و امامت

موضع شاکر آباد (کوٹ پنڈی داس)، شیخوپورہ روڈ و گوجرانوالہ کے دوشاخہ کے مابین "مرید کے منڈی کے نواح میں واقع ہے اور جسے فی الوقت سڑک کے ذریعے ایک طرف شیخوپورہ سے اور دوسری طرف لاہور سے ملا دیا گیا ہے ، فی الوقت شیخوپورہ کا آبادی کے لحاظ سے بہت بڑا قصبہ ہے ۔ یہ قصبہ تقسیم ملک سے پہلے معروف ہندو سیاستدان

اور جاگیر دار پنڈی داس کے نام سے منسوب ایک مشہور قصبہ تھا، صاحب "مخزن پنجاب" مفتی غلام سرور قادری نے بھی اس کا تذکرہ ایک قدیم قصبے کے طور پر کیا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد اس قصبے کی آبادی اور شہرت میں جو بے پناہ اضافہ ہوا، اس کی بنیادی وجہ "کمبوہ قوم" کا اس قصبے کو اپنی سکونت و رہائش کے لیے منتخب کرنا ہے۔ ہندوستان کی ریاست پٹیالہ میں کمبوہ قوم کے جو سترہ بڑے بڑے گاؤں اور قصبات تھے، ان کی تمام مسلم رعایا ترک وطن کر کے پاکستان چلی آئی۔ ان میں سے تقریباً دو تہائی لوگ صرف اسی قصبے میں آباد ہوئے۔ اسی بنا پر اس کی آبادی میں غیر معمولی طور پر بہت اضافہ ہوا اور آبادی کے لحاظ سے ضلع شیخوپورہ کا شاید ہی کوئی قصبہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہو۔

بڑا قصبہ ہونے کے باعث اسے یونین کونسل کا درجہ دیا جا چکا ہے۔ سابقہ بلدیاتی انتخابات میں اس پورے حلقے کے کونسلر بھی قصبہ مذکور کے چوہدری محمد منظور بنے۔ فی الوقت یہاں کا اپنا ڈاک خانہ، ہسپتال اور لڑکیوں کا ایک سکول اور ایک لڑکوں کا ہائی سکول ہے۔ نیز پختہ سڑک کے باعث آنے جانے کی سہولتیں حاصل ہیں۔

قصبہ مذکورہ میں مغربی جانب قصبے کی سب سے بڑی مسجد" جامع مسجد مدینہ" واقع ہے، یہاں حافظ صاحب کے سُسر حاجی رمضان صاحب امامت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ بقول ان کے جب ان کی حافظ صاحب کے ساتھ کراچی میں حج کے لیے جاتے ہوئے اوّلین ملاقات ہوئی تھی، انہوں نے اسی وقت یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بن سکا تو حافظ صاحب سے اپنے ہی قصبہ میں" دینی خدمت" لیں گے۔

جب حافظ صاحب دسمبر ۱۹۶۳ء میں یہاں پہنچے تو اس وقت ابھی حافظ صاحب کا یہاں ٹھہرنے کا ارادہ نہیں بنا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں انہوں نے رمضان المبارک میں اسی مسجد میں قرآن مجید سنایا اور پورے رمضان المبارک میں صبح کی نماز کے بعد درس قرآن دیا اور جمعہ کی نماز اور خطبات میں لوگوں کو اپنے مواعظ سے مستفید کیا۔

حافظ صاحب کو قدرت نے "مردانہ آواز" کا خصوصی ملکہ دیا تھا اور قوت بیانیہ اور "تقریر" کی خصوصی صفت بخشی تھی۔ کسی مشکل سے مشکل مضمون کو آسان کر کے سامعین تک پہنچانا اور جاہل عوام کو سمجھانا ان پر ختم تھا۔ اسی بنا پر ان کے اس ایک مہینہ کی اعزازی خدمت نے مسجد کی کایا پلٹ دی۔ نمازیوں اور سامعین کی کثرت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ لوگ مسجد کی چھت پر چڑھ کر نماز پڑھتے اور ان کا وعظ سنا کرتے تھے۔

رمضان المبارک گذرا تو علاقے کے چیدہ چیدہ سرکردہ افراد نے حافظ صاحب کو اسی جگہ "امامت و خطابت" کے فرائض انجام دینے کی درخواست کی، جو حافظ صاحب نے کچھ تذبذب کے ساتھ قبول کرلی۔ اس طرح "جامع مسجد مدینہ" شاکر آباد (کوٹ پنڈی داس) کو حافظ صاحب کی صورت میں ایک جوان سال و پرعزم رہنما مل گیا، جن کی قیادت و امامت میں اس مسجد اور اس علاقے نے مذہبی طور پر بہت ترقی کی۔

حافظ صاحبؒ نے مسجد کی ذمّہ داریاں سنبھالیں تو تین اہم خدمات انجام دینا شروع کر دیں:

۱۔ امامت: جامع مسجد مدینہ میں حافظ صاحب پنجگانہ نمازوں کی امامت کراتے تھے؛ ان کی عدم موجودگی میں یہ خدمت ان کے خُسر حاجی محمد رمضان صاحب انجام دیا کرتے تھے۔

۲۔ درس: ہر صبح نماز فجر کے بعد آدھ گھنٹہ کا درس قرآن ہوتا تھا۔

۳۔ خطابت: جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھاتے اور خطبہ جمعہ پڑھتے تھے۔

مسجد کی یہ تینوں خدمات انہوں نے اپنی وفات شعبان ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء تک یعنی اٹھارہ سال بدستور انجام دیتے رہے اور اس میں فرق نہ آنے دیا۔

تدریس: حافظ صاحب اپنے اساتذہ سے دینی خدمت کی جو لگن اور محبّت لے کر آئے تھے، اس کی تشفی محض امامت و خطابت سے نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے

گرامی قدر اساتذہ کو "مردم سازی" کرتے دیکھا تھا، لہٰذا ان کے دل میں قدرتی طور پر یہی جذبہ اور یہی لگن تھی کہ وہ بھی تدریس کے فرائض انجام دیں۔

شوال ۱۳۸۲ھ/جنوری ۱۹۶۴ء میں جب یہاں حافظ صاحب کا تقرر عمل میں آیا تو قصبہ مذکور میں دو مدرسے کام کر رہے تھے: ایک بڑا مدرسہ تھا، جسے بیرونی مدرسہ کہا جاتا تھا، جس کا ذکر ہم بعد میں کرنے والے ہیں اور دوسرا مدرسہ قصبے کے عین درمیان میں سکھوں کے ایک پرانے "گوردوارے" میں کھولا گیا تھا۔ گوردوارے کا اس سے بہتر مصرف شاید ہی کسی نے ڈھونڈا ہو۔ اس گوردوارے میں حافظ صاحب کے سُسر حاجی محمد رمضان اور مولوی خیر دین صاحب بچوں و بچیوں کو ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ حافظ صاحب کی تشریف آوری سے اہل قصبہ کی یہ دیرینہ آرزو ایک عالم و فاضل شخص کے ملنے سے پوری ہوتی نظر آئی، چنانچہ حافظ صاحبؒ نے "جامع مسجد مدینہ" میں بچوں کا مدرسہ قائم کر دیا۔ جہاں ناظرہ اور حفظ قرآن دونوں کی تعلیم ہوتی تھی۔ یہ مدرسہ حافظ صاحب کی بیرونی مدرسہ میں تشریف آوری تک بخوبی چلتا رہا۔ بعد میں یہ بند کر دیا گیا اور اس کے تمام بچے بیرونی مدرسہ میں منتقل ہو گئے۔

مدرسہ کاشف العلوم میں فرائض تدریس

مدرسہ کی بنیاد اور اسکے مقاصد قوموں کی تاریخ میں یہ اکثر ہوتا ہے کہ ایک شخص اُٹھ کر قوموں اور ملکوں کی قسمت بدل دیتا ہے۔ دنیا کی تاریخ ایسے اولوالعزم اور جواں ہمت لوگوں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ مدرسہ کاشف العلوم کی تاسیس بھی ایک ایسے جواں ہمتی کے جذبے کا پرتو ہے۔

مدرسہ کے بانی اور اس کے ناظم چوہدری علی حسن صاحب ایک سیدھے سادھے، مگر جواں ہمت شخص ہیں ۶۱ - ۱۹۶۰ء میں خدا تعالیٰ نے ان کے دل میں مدرسے کی تاسیس

و بنا کا جذبہ پیدا کیا ۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے گاؤں کے شمالی طرف واقع ایک پُرانے ٹیلے پر (جو بے آباد تھا) : اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا انہوں نے آغاز کر دیا۔ ان کے ساتھ ان کے دونوں بھائی فتح دین اور محمد شریف مرحوم بھی شریک تھے ۔ اس جگہ ٹیلے کو ہموار کرتے وقت بے شمار سانپ یہاں سے نکلے جنھیں مار دیا گیا ۔ بعدازاں یہاں ایک چھوٹا سا حجرہ بنایا گیا ، اس طرح ایک کمرے سے مدرسے کا آغاز ہوا ۔

اوّلین طالب علم | مدرسے کا آغاز اسی وقت ہو سکتا تھا جب اس مدرسے کے لیے کچھ طالب علم مل جاتے ۔ اس مقصد کے لیے ناظم صاحب اور ان کے دوست مولوی معلّم دین پر مشتمل ایک وفد نے موضع ایچو گل ، ضلع و تحصیل لاہور کا دورہ کیا ، جہاں کمبوہ برادری کی خاصی تعداد آباد ہے ۔

راقم الحروف اس وقت دوسری جماعت میں پڑھتا تھا ، عمر تقریباً سات اور آٹھ سال کے درمیان ہوگی ۔ جب یہ وفد موضع مذکور میں پہنچا اور اس نے بعد از نماز مغرب مدرسہ کے لیے بچوں کو بھیجنے کی اپیل کی ، تو پہلا نام جو اس وفد کے سامنے پیش کیا گیا وہ راقم الحروف کا تھا ۔ راقم نے خود ہی کھڑے ہو کر اپنا نام لکھوا دیا تھا اور والد (عمر دین) صاحب مرحوم سے بھی پوچھنے کی نوبت نہ آئی تھی ۔ بہر حال والد مرحوم نے بخوشی اجازت دیدی ، جس کے لیے راقم الحروف کو اپنی والدہ کی منّت سماجت کرنا پڑی تھی ۔ دوسرا نام راقم الحروف کے ماموں زاد بھائی محمد مشتاق ولد محمد سلیمان کا ان کے والد صاحب نے پیش کیا ۔ الغرض یہ وفد دو طالب علموں کو لے کر واپس پلٹا ، مدرسۂ مذکور کے یہ اوّلین طالبعلم تھے ۔

جب ہم پہلی بار مدرسہ میں پہنچے تو وہاں ایک برائے نام کمرہ بنا ہوا تھا ، اور چاروں طرف بے آباد خالی علاقہ پڑا تھا ۔ اس جگہ کی چار دیواری اور بڑے ہال کی تعمیر کچھ عرصہ بعد وقوع میں آئی ، جس میں مذکورہ ننھے منے طالب علموں نے بھی حصّہ لیا تھا ۔

اوّلین استاد | اس مدرسہ کی یہ حسنِ سعادت تھی کہ اس کو شروع میں ہی ایسے مہربان

اور مخلص اساتذہ میسّر آئے، کہ جن کی مثال ملنا مشکل ہوگی، اس کے اوّلیں استادوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حافظ محمدؐ ایوب صاحب۔ مدظلہ حافظ محمدؐ ایوب صاحب جو اس وقت تقریباً زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکے ہیں، اس مدرسہ کے اوّلین استاد مقرر ہوئے۔ حافظ صاحبؒ نے حفظ قرآن کے بعد سلطان پورہ (اونچی مسجد، مولانا شیر شاہ صاحب) خانقاہِ ڈوگراں اور چنیوٹ (مولانا محمد نعمان بیدڑوی)، جڑانوالہ (مرکزی جامع مسجد، مفتی محمدؐ امین لدھیانوی)، بوئی گاڑھ، ضلع کیمبلپور (مولانا ضیاء الدین، شمس الدین)، انجمن نعمانیہ، لاہور (مفتی محمد حسین نعیمی)، حزب الاحناف، لاہور (حافظ محمدؐ عالم) اور جامعہ اشرفیہ لاہور (مولانا رسول خان صاحبؒ وغیرہ) سے کتب درسیہ پڑھیں، جبکہ اورینٹیل کالج لاہور (پرنسپل ڈاکٹر سیّد عبداللہ، استاد پروفیسر نور الحسن) سے مولوی فاضل کیا، مگر عین دورۂ حدیث شریف کے سال بیمار پڑ گئے اور تقریباً ڈیڑھ برس بیمار رہے، اس طویل علالت کے باعث دورۂ حدیث شریف اور سند فراعت سے محروم رہے۔

دورۂ حدیث شریف میں عدم شرکت کے باوجود ان کی علمی استعداد نہایت اعلیٰ وارفع ہے، ہر قسم کی عربی کتابوں اور تصانیف کا مطالعہ کر سکتے ہیں، بعد میں انہوں نے لاہور کے طبیہ کالج سے تین سالہ تعلیم کے بعد "حکیم حاذق" کی سند حاصل کی اور کچھ عرصہ قصبے میں طبابت بھی کرتے رہے۔

حافظ صاحب کی شخصیت میں جو چیز دیکھنے والے کو بےحد متاثر کرتی ہے وہ انکا تقویٰ خلوص اور پاک بازی ہے۔ ان کے زہد و اتقا کی بہت کم مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں، علاوہ ازیں وہ "عدم تعصب" میں اپنی مثال آپ ہیں انہوں نے اپنی تعلیم دونوں مکاتبِ فکر کے (دیوبندی، بریلوی) علما کے ہاں رہ کر مکمل کی۔ اسی لیے وہ ہمیشہ مسلکی تفریق سے خود کو بالاتر رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر دونوں مسلکوں کے لوگ بلا جھجک ان کے پیچھے نماز پنجگانہ پڑھتے ہیں، انہوں نے ابھی تک اپنی مسجد (عرفِ عام میں بڑی مسجد) کو "رسومات زمانہ" سے بچا کر رکھا ہوا ہے۔

موضع کوٹ پنڈی داس کے "مدرسہ کاشف العلوم" کی "تاسیس و تعمیر" میں انکی ذات کا بھی بڑا حصہ ہے، کیونکہ اس وقت پورے قصبے میں وہی "روشنی کا چراغ" تھے۔ ان کا منصوبہ مدرسہ کو بہت آگے لے جانے کا تھا، جس پر بعد کے باہمی اختلافات کے باعث عملدرآمد نہ ہو سکا۔

حافظ صاحب مدرسہ کے اوّلین استاد تعینات ہوئے۔ چونکہ ان کی سکونت قصبہ میں تھی، جہاں وہ "بڑی مسجد" کے امامت و خطابت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، اسی لیے وہ ہمہ وقت مدرسہ میں نہیں رہ سکتے تھے، تاہم وہ دن کا بڑا حصہ مدرسہ میں بسر کرتے تھے۔ بعض اوقات رات کو اٹھ کر طلبہ کو دیکھنے کے لیے مدرسہ چلے آتے۔ ایسے خلوص و جذبہ کی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ انہی کی کوششوں سے پشاور اور کوہاٹ کے طالب علم مدرسہ کاشف العلوم میں حصول تعلیم کے لیے آتے تھے۔

حافظ محمد ایوب صاحب مدظلہ اور حافظ محمد لیس صاحب مرحوم و مغفور میں معمولی نوعیت کے اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کا حد درجہ ادب و احترام کا رشتہ قائم تھا۔ حافظ محمد بلال صاحب کے مطابق جب وہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر کے حافظ محمد ایوب صاحب کی خدمت میں "حجازی" ٹوپی کا ہدیہ لے کر پہنچے تو حافظ صاحب اس حجازی ہدیہ سے بڑے خوش ہوئے اور پھر ایک بوسیدہ سی پرانی ٹوپی نکال کر دکھائی کہ میں نے حافظ محمد لیس صاحب کا یہ حجازی تحفہ (جو انہوں نے حج بیت اللہ کے بعد بھیجا تھا) ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں حافظ محمد لیس مرحوم نے حافظ محمد ایوب صاحب کو ایک بہشتی زیور بھی ہدیۃً بھیجا تھا، جو ان کے پاس ابھی محفوظ ہے۔

حافظ محمد لیس صاحب کی وفات کے وقت وہ بڑے افسردہ اور پریشان تھے انھیں یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ "آج اس قصبے سے ایک حق گو عالم رخصت ہو گیا"۔ الغرض دونوں کے مابین مثالی تعلقات قائم تھے۔

۲۔ حافظ رحمت اللہ صاحب: مرحوم ومغفور اس مدرسہ کے دوسرے استاد حافظ رحمت اللہ صاحب مرحوم ومغفور تھے جن کی جواں مرگ پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ انہوں نے لاہور میں قرآن مجید حفظ کیا تھا اور مزنگ کے مدرسہ ترتیل القرآن میں قاری محمد شاکر قاسمی اور ان کے دیگر فاضل بھائیوں سے فن قرارت سیکھا تھا۔ حافظ صاحب کا گلا اور تلفظ نہایت عمدہ تھا۔

حافظ رحمت اللہ صاحب بھی خلوص و جذبے میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ چوبیس گھنٹے مدرسہ میں رہتے تھے، طلبہ کے ساتھ ہی کھاتے، ان کے ساتھ کھیلتے اور رات دن ان کی نگرانی کا کٹھن کام انجام دیا کرتے تھے۔

رات کو طالب علموں کو آموختہ یاد کرانا، صبح سویرے انھیں اٹھانا، ان کا سبق سننا اور سبقی سننا وغیرہ ان کے ذمہ تھا۔ وہ اپنے اس کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔

وہ طالب علموں کے لیے حد سے زیادہ شفیق و مہربان تھے۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ ایک بار ایک مقامی کسان نے بعض طلبہ کو مارا تھا، تو حافظ صاحب تنہا اس کے ساتھ جا الجھے تھے۔ الغرض وہ بڑے ہی شفیق و مہربان استاد تھے۔

راقم الحروف کے حال پر حافظ صاحب کو خصوصی شفقت تھی اور یہ ان کی شفقت و مہربانی کا نتیجہ تھا کہ راقم الحروف نے بہت چھوٹی سی عمر میں اور نہایت ہی کم مدت (تقریباً سوا سال) میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کر لی تھی۔ حافظ محمد لیس صاحب کے ساتھ انکے بھی قریبی مراسم تھے۔ بیماری کے دنوں میں حافظ محمد لیس صاحب کو بلا بھیجا اور "کہا سنا" معاف کرایا۔ حافظ صاحب نواح ۱۹۷۴ - ۱۹۷۵ء میں بعارضۂ دمہ وفات پا گئے۔

۳۔ جز وقتی اساتذہ ان دو ہمہ وقتی استادوں کے علاوہ دو جز وقتی استاد یا نگران بھی تھے، جو رضا کارانہ طور پر یہ خدمات انجام دیتے تھے۔ ان میں سے ایک تو نابینا حافظ صاحبؒ تھے، جو حافظ رحمت اللہ مرحوم کے ساتھ قرآن مجید صاحب کا دور کرنے کے لیے تشریف

لائے تھے اور تقریباً چار مہینے تک مدرسہ میں قیام پذیر رہے تھے۔ یہ حافظ صاحب بھرے ہوئے جسم والے اور وجیہ و شکیل تھے، حافظہ بڑے غضب کا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ان میں سخت گیری بہت زیادہ تھی۔ طالب علموں کو بلا دریغ مارپیٹ کرنا اور انہیں تشدد کا نشانہ بنانا ان پر ختم تھا۔ راقم الحروف کے ساتھ انھیں خصوصی کد تھی۔ راقم انکی آمد پر الکیسویں پارے پر تھا اور جس دن کہ وہ واپس گئے، سورۃ الفیل زیر سبق تھی۔ انھیں ہر چند "تقریب ختم" میں شرکت کی دعوت دی گئی، مگر وہ شامل ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ انکے جانے پر راقم سمیت تمام طلبہ نے سکھ کا سانس لیا۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں اور کس حالت میں ہیں؟

دوسرے جز وقتی استاد مولوی علم دین صاحب تھے، جو مذکورہ قصبے کی معروف شخصیت ہیں۔ مولوی علم دین صاحب بفضلہٖ تعالیٰ بڑے حاضر جواب اور بذلہ سنج شخصیت کے مالک ہیں۔ انھیں "لاجواب" ہونا تو جیسے آتا ہی نہیں۔ تمام قصبے میں وہ اپنی اس صفت میں ممتاز و متعارف ہیں۔

مولوی علم دین صاحب اعزازی طور پر مدرسہ اور طلبہ کی نگرانی کے کام پر مامور تھے۔ طلبہ کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے تھے اور پند و موعظت کے ذریعے ان کو اچھا بُرا سمجھاتے رہتے تھے۔ پرندوں کے شکار کھیلنے کا شوق قدرت نے انھیں بہت وافر دیا تھا۔ اپنے اس شوق میں وہ حافظ محمد ایوب صاحب اور مدرسہ کے طلبہ کو شریک کر لیا کرتے تھے۔ خود راقم الحروف بھی کئی باران کی "چڑی و بگلہ مار" پارٹی میں شامل ہونیکا شرف رکھتا ہے۔

مدرسہ میں اختلاف اور اساتذہ کا استعفا جس سال حافظ محمد الیاسؒ نے جامع مسجد مدینہ کا انتظام و انصرام سنبھالا اور اس میں مذکورہ بالا خدمات انجام دینا شروع کیں، اسی سال، بماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴ء مدرسہ میں ایک چھوٹے سے واقعے سے ایسا اختلاف پیدا ہوا، جس کی بعد میں کبھی تلافی نہ کی جا سکی۔

یہ اختلاف مولوی علم دین صاحب کی وجہ سے پیدا ہوا، انھوں نے قصبہ مذکورہ میں ایک ایسا نکاح پڑھا دیا، جس میں پورا گاؤں اور تمام اہل مساجد۔ اس نکاح کے خلاف تھے۔ اس پر ردِ عمل ہوا اور نتیجۃً ناظم علی حسن صاحب پر اہل قصبہ نے زور دیا کہ وہ اُنکا داخلہ مدرسہ میں فوری طور پر بند کر دیں۔ ناظم علی حسن صاحب نے مولوی علم دین کا داخلہ روکنے کے لیے مذکورہ دونوں اساتذہ پر زور دیا، جبکہ مذکورہ اساتذہ یہ ذمہ داری ناظم صاحب پر عائد کرتے تھے، پھر جب ناظم صاحب نے اپنے موقف پر زیادہ ہی اصرار کیا تو دونوں اساتذہ نے اپنے اپنے استعفے پیش کر دیے، جو ناظم صاحب نے قبول کر لیے۔ اس طرح طالب علم اور مدرسہ ساڑھے تین چار سال تک مدرسہ کی بے لوث خدمت کرنے والے مشفق و مہربان اساتذہ کی خدمات سے محروم ہو گیا۔ جس روز طالب علموں کو ان اساتذہ کے رخصت ہو جانے کا علم ہوا تو تمام طلبہ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور بڑے غم و غصّے کا اظہار کیا۔ بہرحال ان اساتذہ کرام کے خلوص و جذبے کو ان کے شاگرد اور اہل قصبہ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

حافظ محمد لیس رح کی مدرسہ میں تقرری ان اساتذہ کے جانے سے مدرسہ میں جو کمی پیدا ہو گئی تھی۔ اسے صرف حافظ محمد لیس صاحب ہی پورا کر سکتے تھے، چنانچہ اس تنازعے کے بعد ناظم صاحب اور مولوی خیر الدین صاحب (خطیب مسجد مولوی خیر دین ام ۱۹۸۷ء) حافظ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور ان سے مدرسہ کا چارج سنبھالنے کی درخواست کی۔

کوئی اور شخص ہوتا تو فوراً اس دعوت پر لبیک کہتا اور شرائط طے کر کے مدرسہ میں جا بیٹھتا، مگر حافظ صاحب نے صلاح و مشورے کے بغیر اس وادی میں قدم رکھنا گوارا نہ کیا، انہوں نے اس وفد کو صاف صاف کہہ دیا کہ میں اپنے استادوں کے حکم کا پابند ہوں، اگر انہوں نے مجھے مشورہ اور اجازت دی تو میں ضرور مدرسہ سنبھال لونگا؛ اس لیے بجائے مجھ سے پوچھنے کے، میرے استاد محترم حافظ خیر الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ کاشف العلوم

بلال پارک سے جاکر پوچھیں اور اجازت لیں۔ اِدھر یہ وفد بلال پارک آنے کے لیے تیار ہوا۔ اُدھر حافظ صاحب نے حافظ خیر الدین صاحب کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا جس میں اس صُورتِ حال پر انہیں فیصلہ کرنے اور مشورہ دینے میں "مختار و مجاز" ٹھہرایا۔ اس خط کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

۷۸۶

۱۲ جمادی الاوّل ۱۳۸۴ھ

محترم المقام قبلہ حضرت استاد صاحب مدظلہ العالی!

"السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ اُمید ہے کہ مزاج بخیر ہونگے۔ عرض یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں علی حسن باہر والے مدرسہ کے ناظم مولانا خیر الدین صاحب و دیگر احباب آرہے ہیں۔ یہ اس فقیر کو باہر والے مدرسہ میں لے جانا چاہتے ہیں۔ چونکہ وہاں کے استاد وہاں سے چلے گئے ہیں۔ آپ برائے کرم جو بھی اس فقیر کے حق میں مناسب سمجھیں اس پرچہ کی پشت پر تحریر فرما دیں اور علی حسن صاحب کو حسبِ ذیل چیزیں ضرور گوش گذار کر دیں۔ تاکہ آئندہ یہ مجھے ان کے عمل پر مجبور نہ کرے: (۱) مغرب اور عشا اور فجر کی نمازیں اپنی موجودہ جگہ پر پڑھاؤنگا۔ چونکہ بعد عشا کتاب پڑھنی ہوتی ہے اور بعد فجر درس قرآن پاک دینا ہوتا ہے! (۲) قصبہ کے احباب اگر کہیں بیان کے لیے کہیں تو ناظم مدرسہ کو روکنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔ (۳) ایک استاد حافظ صاحب میرے ساتھ اور رکھنا ہوگا۔ (۴) جو بات مجھ میں خلافِ شریعت یا مدرسہ کے قانون کے خلاف دیکھیں، لوگوں سے کہنے کے بجائے بلال پارک لاہور میرے استاد مدظلہ سے شکایت کریں۔

فقط والسّلام محمد لئیس کرنالوی بمقام کوٹ پنڈیداس ضلع شیخوپورہ۔

حافظ صاحب نے اپنے اس خط میں جو تجاویز یا شرائط پیش کی ہیں وہ نہایت ہی معقول ہیں چنانچہ حسب قرار داد حافظ خیر الدین صاحب نے یہ تمام تجاویز اور شرائط مذکورہ وفد کے سامنے پیش کر دیں۔ وفد نے یہ تمام شرطیں بلا کسی حیل و حجت کے منظور کر لیں، اس پر حافظ خیر الدین صاحب نے حافظ صاحب کو جوابی خط میں حسبِ ذیل مضمون ارسال کیا:

عزیزم مولوی لئیس صاحب!

السلام علیکم۔ علی حسن صاحب کے مدرسہ کے ٹوٹ جانے پر بہت افسوس ہوا۔ آپ جا کر مدرسہ کو سنبھالیں اور اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیں اور کسی قسم کی کوئی بات چیت نہ کریں۔ یعنی مدرسہ چھوڑنے والوں کے خلاف اور آپ کی تمام شرائط علی حسن صاحب نے منظور کر لی ہیں اور تنخواہ کے متعلق بھی میں نے پوچھا تھا۔ وہ علی حسن صاحب اور مولوی صاحب اور تیرے بزرگ یوں فرماتے تھے کہ یہ ہم خود کر لیں گے۔ مدرس کے متعلق بھی میں کوشش کروں گا۔ جو آپ کے ماتحت کام کرے گا۔ باقی بات چیت کبھی آپ آئیں گے زبانی کرونگا۔ فقط والسلام

خیر الدین عفی عنہٗ

بلال پارک لاہور

حافظ محمد لئیس کی مدرسہ میں تشریف آوری

الغرض چند دنوں کے بعد جب باہم جانبین سے عہد و اقرار نامہ ہو گیا تو حافظ محمد لئیس صاحب نماز فجر کے درس کے بعد بماہ جمادی الاول ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴ھ مدرسہ میں تشریف لے آئے۔ طلبہ کا ابتدائی ردِ عمل ملا جلا تھا۔ خوشی بھی تھی کہ مدرسہ آباد رہے گا اور غم بھی کہ اب پہلے استاد واپس نہ آسکیں گے۔

اساتذہ کی اس تبدیلی کا فوری اثر یہ ہوا کہ جو پٹھان طالب علم زیر تعلیم تھے وہ آہستہ آہستہ یہاں سے واپس چلے گئے اور آئندہ بھی پٹھانوں کی آمد کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

حافظ صاحب نے تشریف لا کر راقم الحروف کو تیسرا المبتدی شروع کرائی تھی، مگر افسوس کہ مکمل نہ ہوسکی۔

حافظ محمدؐ سعید کی تشریف آوری اور بچوّں کی تقسیم

حافظ محمد الیٰس صاحب نے من جملہ دیگر شرطوں کے ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ ان کے ساتھ ایک اور حافظ صاحب کو بطور استاد کے تعینات کیا جائے گا۔ اس پر حافظ خیر الدّین صاحب نے انھیں لکھا تھا کہ وہ اس کی بھی کوشش کرینگے۔ حافظ خیر الدین مرحومؒ نے جلد ہی یہ وعدہ پورا کیا اور مدرسہ بلال پارک ہی کے ایک فارغ التحصیل حافظ سعید احمد صاحب مدظلہٗ، کو حافظ صاحب کا معاون بنا کر بھیج دیا۔

حافظ سعید صاحب قصور کے قرب وجوار کے رہنے والے تھے، عمر کوئی بیس بائیس برس کے درمیان ہوگی۔ اردو اپنے میواتی لہجے میں بولا کرتے تھے۔ بلال پارک میں حافظ عثمان اور قاری محمد صدیق صاحب ان کے خصوصی استاد تھے، قرآن مجید کی منزل خوب یاد تھی مصری لہجے میں ترتیل کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت اپنی باریک اور مترنم سی آواز میں کیا کرتے تھے۔

حافظ سعید صاحب بڑے مخلص اور ذی استعداد معلّم ہیں۔ حافظ رحمت اللہ صاحب کی طرح وہ بھی مدرسہ ہی میں قیام پذیر تھے اور طلبہ کی ہمہ وقتی نگرانی کرتے تھے۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ جب حافظ صاحب تشریف لائے تو مغرب کی نماز کا وقت ہونے والا تھا، انہوں نے آکر مغرب کی نماز مدرسہ میں پڑھائی تھی، ان کی تلاوت کو تمام لوگوں نے پسند کیا تھا۔

اگلے دن یا چند دنوں کے بعد باہمی صلاح مشورے سے مدرسہ کے طالب علموں کی

تقسیم دو حصّوں میں عمل میں آئی۔ اس سے پیشتر تمام طلبہ ایک ہی جگہ اکٹھے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ مگر اب انتظامی اور تدریسی نقطۂ نظر سے حافظ محمد لیس صاحبؒ نے یہ تقسیم ناگزیر خیال کرتے ہوئے تمام طلبہ کو دو حصّوں میں بانٹ دیا تھا۔

راقم الحروف کے خیال میں ہر استاد کو ۵۰ — ۶۰ طلبہ دیے گئے تھے، اس تقسیم میں راقم الحروف کا نام حافظ سعید صاحب کے طلبہ کی فہرست میں نکلا، یوں راقم الحروف ان کے دامن سے وابستہ ہو گیا۔

حافظ محمد لیس صاحبؒ کی تدریسی خدمات جیسا کہ اوراق سابقہ میں ذکر آچکا ہے کہ سابق اساتذہ کے چلے جانے سے مدرسہ کی حالت دگرگوں ہو گئی تھی، اسی حالت کو حافظ خیر الدین صاحب مدرسہ کے ٹوٹ جانے سے تعبیر کرتے ہیں، حافظ محمد لیس صاحب کی مدرسہ میں تشریف آوری سے، گو پہلے جیسا ماحول تو واپس نہیں آسکا، لیکن بہر حال مدرسہ کی آئندہ زندگی اور اس کی کارکردگی پر بڑا اثر پڑا، حافظ صاحب کی ذات ہی کی وجہ سے مدرسہ کو استحکام ملا اور وہ اس اختلاف و انتشار کے نازک موقعے سے مدرسہ کو ثابت قدمی سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

حافظ محمد لیس صاحب ایک نہایت اچھے اور شفیق استاد تھے۔ وہ شروع سے ہی مدرسہ میں نظم و ضبط اور ڈسپلن کے قائل تھے، چنانچہ انہوں نے طلبہ کے سبق یاد کرنے اسبق سنانے اور منزل سنانے جیسے معاملات میں نظم و ضبط پیدا کیا۔ ان سے پہلے سبق وغیرہ کے لیے قرآن یا سیپارے پر سبق کا نشان نہیں لگایا جاتا تھا، انہوں نے طلبہ کے قرآن یا سیپاروں پر سبق کا نشان لگانا شروع کیا۔ الغرض، ہر کام میں نظم و ضبط پیدا کرنا انہی کا کام تھا۔

مدرسہ میں انہوں نے تقریباً ۱۷ - ۱۸ سال تک تدریسی خدمات انجام دی ہیں اس عرصے میں وہ مدرسہ کے سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ مدرسہ کی شہرت کو دور دور پہنچایا۔ مدرسہ کے لیے قصبہ میں ہمدردانہ جذبات پیدا کیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے مدرسہ

کی مسجد کو اہل قصبہ کی عید گاہ بنایا، جہاں دور دراز سے لوگ آکر نماز عید پڑھا کرتے تھے۔ اندازہ ہے کہ ان سے ۶۰ ۔ ۷۰ طلبہ نے حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ ان میں سے بہت سے طلبہ کو انہوں نے اپنی معرفت بڑے مدارس میں پہنچایا، جہاں سے وہ فارغ التحصیل ہو کر، آج مختلف شہروں اور ضلعوں میں دینی و تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

خود راقم الحروف کو انہوں نے ہی اپنی معرفت ٹنڈو الہ یار میں مولانا جمشید صاحب کے پاس بھیجا تھا، مگر شومی قسمت سے مولانا جمشید صاحب اسی سال مدرسہ چھوڑ کر مرکز تبلیغ رائیونڈ آچکے تھے، اس لیے وہاں تعلیم جاری رکھنا ممکن نہ ہو سکا۔ راقم الحروف اور برادرم حافظ قاری شبیر احمد صاحب نے یہ سال شہداد پور کے مدرسہ عربیہ حسینیہ میں گذارا۔

حافظ صاحب کی شفقت کا یہ واقعہ اب تک یاد ہے کہ انہوں نے ہمیں جب گاڑی پر سوار کرایا تو اپنی جیب خاص سے دونوں کو پانچ پانچ روپے دیے۔ یاد رہے کہ اس وقت راقم الحروف کا حیدر آباد سندھ تک کرایہ مبلغ دس روپے تھا۔ یہ گویا اپنی منزل تک پہنچنے کا نصف کرایہ تھا، بعد میں بھی محبت و شفقت کا یہ سلوک انہوں نے اسی طرح جاری رکھا۔

حافظ محمدؒ سعید صاحب سے اختلاف مدرسہ کے نظم و نسق میں حافظ محمدؒ لیس صاحب کو اوّلیت حاصل تھی۔ جبکہ حافظ محمد سعید صاحب ثانوی درجے پر تھے۔ مگر بعض انتظامی مسائل میں دونوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا، جو بڑھتا چلا گیا۔ ان اختلافات کی صدائے بازگشت قصبے اور پھر بلال پارک میں سنی جاتی تھی۔ نجانے یہ اختلافات کیا صورت اختیار کرتے کہ حافظ محمد سعید صاحب ۱۹۶۶ء میں قصبہ اور مدرسہ چھوڑ کر چلے گئے اور یوں مدرسہ کو ایک اور دھچکا پہنچا۔ ان کی جگہ مختلف لوگ آتے رہے، مگر اس جگہ قاری محمدؒ شبیر صاحب کے سوا کوئی اور شخص نہ جم سکا۔

باب چہارم

شادی خانہ آبادی

ابھی حافظ محمد لیس صاحب زیر تعلیم ہی تھے کہ ان کے بزرگوں نے ان کی شادی خانہ آبادی کی تحریک شروع کر دی ۔ یوں بھی حافظ صاحب کی تعلیم میں نسبتہً زیادہ وقت اور عرصہ (تقریباً اکیس سال) صرف ہوا ، اس بنا پر ان کے والدین کی یہ فکر طبعی اور فطری تھی ۔ عام طور پر خود پیاسا کنویں کے پاس چل کر آتا ہے ، مگر بعض اوقات خود کنواں بھی پیاسے کے پاس پہنچ جاتا ہے ، حافظ صاحب مرحوم کے ساتھ ہی کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی ۔

۱ - حافظ صاحب کا سسرالی خاندان حافظ صاحب کی شادی خانہ آبادی موضع کوٹ پنڈی داس کے معروف زمیندار ، اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں پیش پیش حاجی محمد رمضان صاحب کے ہاں طے پائی ۔ حاجی صاحب کی ولادت موضع اجری (ریاست پٹیالہ ، انڈیا) میں نواح ۱۹۲۱ء ہوئی ، مگر محض چار سال کی عمر تھی کہ وہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے ۔ اس طرح ان کی تمام پرورش ان کے ایک تایا قطب الدین ساکن سیہوں مزارعہ نے کی ۔ سات سال کی عمر میں اسکول میں داخل ہوئے اور بارہ سال کی عمر تک یعنی ۱۹۳۳ء میں چار جماعت پاس کر لیں ، جو اس زمانے کی عام جہالت اور بے علمی میں بہت غنیمت خیال کی جاتی تھیں ۔ قرآن مجید کی تعلیم انہوں نے سیہوں مزارعہ کے حافظ غلام قادر سے حاصل کی ، بہشتی زیور اور دینی مسائل میں ان کے استاد مولوی خیر دین (مرحوم) تھے ۔

تقسیم ملک کے بعد وہ تین مہینوں تک کوٹ لکھپت کے مہاجر کیمپ میں مقیم رہے ، بعد ازاں ۱۹۴۸ء میں وہ موضع اچوگل (ضلع و تحصیل لاہور) میں چلے گئے ، ایک سال

وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں خانیوال (سابق تحصیل صدر مقام، حال ضلعی صدر مقام) کے چک نمبر ۷۷ میں جا کر آباد ہو گئے، مگر وہاں بھی دل نہ لگا۔ بالآخر ۱۹۵۰ء میں وہاں سے بھی نقل سکونت کر کے موضع کوٹ پنڈی داس میں چلے آئے اور یہیں اپنی زمین الاٹ کرالی۔

۱۹۵۴ء میں مولوی خیر دین صاحب کے ساتھ مل کر موضع مذکور کے "سکھ گوردوارے" میں مدرسہ "تعلیم القرآن" شروع کیا۔ یہ مدرسہ ۱۵ سال یعنی نواح ۱۹۶۸ء تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا، اس مدرسے میں طلبہ اور طالبات دونوں کو ناظرہ قرآن مجید اور دینی مسائل (از قسم بہشتی زیور وغیرہ) کی تعلیم اور لکھائی وغیرہ سکھائی جاتی تھی۔ اس مدرسہ سے دو سو کے قریب طالبات اور ڈیڑھ سو کے قریب طالب علموں نے فراغت پائی۔ ۱۹۵۷ء میں انھیں حج بیت اللہ اور زیارت حرمین الشریفین کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۵۷ء سے ہی انہوں نے کوٹ پنڈی داس کی مغربی مسجد "مدینہ مسجد" میں اعزازی طور پر امامت و خطابت کے فرائض انجام دینا شروع کر دیے۔ بعد میں اسی مسجد کو حافظ محمد یٰس صاحب مرحوم نے آکر سنبھالا۔ آج کل یہ مسجد موضع مذکور کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ آباد مسجد ہے۔ حاجی صاحب فی الوقت بھی علاقے کے دینی و رفاہی کاموں میں برابر دلچسپی لیتے ہیں۔

۲۔ شادی خانہ آبادی کی تحریک حافظ صاحبؒ کی شادی خانہ آبادی کی تحریک کیسے ہوئی؟ اس کے متعلق حافظ صاحبؒ کے سسر حاجی محمد رمضان صاحب اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

"۱۹۵۷ء میں میں حج کے لیے کراچی پہنچا۔ اس وقت وہ (حافظ صاحب) مدرسہ (عربیہ اسلامیہ) نیو ٹاؤن میں پڑھتے تھے۔ میں ان کے ساتھ مدرسہ میں گیا۔ ان کے استادوں سے ملا۔ مجموعی طور پر میرا حاجی کیمپ کراچی میں

قیام آٹھ روز رہا۔ یہ دونوں ساتھی حافظ محمد لیس صاحب اور حافظ نذیر صاحب میری ملاقات اور اصلاح کے لیے ہر روز یہاں آتے۔ بعدازاں حافظ صاحب ۱۹۵۸ء میں ٹنڈو الہ یار کے مدرسہ میں شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی کی خدمت میں (رہ کر) وہاں باقی کی کتابیں پڑھتے رہے۔ پھر میں نے اس کے اخلاق اور اس کے علم وفضل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوچا کہ کس طرح فراغت کے بعد ہم ان سے اپنے گاؤں (کوٹ پنڈی داس) میں دین کی خدمت کا کام لیں۔ تاکہ ہماری قوم میں جو جہالت اور بے علمی ہے وہ دور ہو جائے۔ ۱۹۵۹ء میں حافظ صاحب کے والد ہمارے پاس ملنے کے لیے آئے۔ ہم نے ان کو حافظ صاحب کے لیے شادی کا پیغام دیا۔ اس نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔ مگر جب حافظ صاحبؒ سے مشورہ کیا۔ اس نے دینی پڑھائی کا عذر پیش کیا۔ کہ میری پڑھائی میں نقصان ہوگا اور یہ کہا کہ ابھی میری فراغت میں تین سال باقی ہیں۔ ہم نے ان کی سب شرائط قبول کر کے رشتہ منظور کر لیا"

۳۔ تقریب شادی خانہ آبادی چونکہ حافظ صاحب اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنے کے حق میں نہ تھے اور سر دست حافظ صاحب کے پاس اہل وعیال کی کفالت کا بھی کوئی بندوبست نہ تھا۔ اسی بنا پر باہمی رضامندی سے یہ طے پایا کہ شادی کے باوجود حافظ صاؔ. کے "اہل خاندان" موضع کوٹ پنڈی داس ہی میں اپنے والدین کے ہاں مقیم رہیں گے اور حافظ صاحب رمضان المبارک کی دو مہینوں کی تعطیلات یہیں آکر گذارا کریں گے۔ نیز یہیں آکر قرآن مجید سنایا کریں گے۔

ان شرائط پر حافظ صاحب کو اور ان کے والدین کو کوئی اعتراض نہ تھا، چنانچہ باہمی رضامندی سے رشتہ طے پاگیا اور ۱۳۹۰ھ / ۱۹۶۰ء کی رمضان المبارک کی تعطیلات میں

ان کی نہایت سادگی، مگر پروقار طریقے سے شادی ہوگئی۔ برات میں سندھ (موضع گوٹھ لسی) کے بھی سب عزیزوں نے شرکت کی، مگر حافظ صاحب اپنے اہل خانہ کے ساتھ یہیں مقیم رہے۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء کے اختتام تک حافظ صاحب کے یہ معمولات جاری رہے۔ ان سالوں میں حافظ صاحب رمضان المبارک کی چھٹیاں یہیں آکر گذارتے تھے، رمضان المبارک میں قرآن مجید سناتے اور فجر کی نماز کے بعد درس قرآن دیتے تھے۔ جس سے پورے قصبہ والے مستفید ہوتے تھے۔

۱۹۶۳ء کے اواخر میں فراغت کے بعد حافظ صاحب نے موضع مذکور میں ہی مستقل قیام کرنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ اپنا مکان بنوا کر اس میں رہائش اختیار کر لی۔

۴۔ اہلیہ محترمہ حافظ صاحب کی اہلیہ محترمہ (اُمّ اسماعیل) نہایت صابرہ وشاکرہ خاتون ہیں وہ اپنے والد کی پہلوٹھی اولاد ہیں۔ حاجی صاحبؒ نے بڑی اولاد ہونے کی حیثیت سے ان پر خصوصی توجہ مبذول رکھی، چنانچہ انہوں نے بہت ابتدائی عمر میں ہی قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا تھا اور دینی مسائل وبہشتی زیور وغیرہ کی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کر لی تھی۔ شادی سے قبل ہی انہوں نے اپنے والد صاحب کے گھر میں بچیوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ شادی خانہ آبادی کے بعد بھی ان کی یہ مصروفیت برقرار اور بحال رہی۔ فی الوقت بھی اُن کا گھر خدا کے فضل وکرم سے ایک "مدرسۃ البنات" کا منظر پیش کرتا ہے۔ جہاں وہ بدستور بچیوں کی تعلیم وتربیت میں مشغول نظر آتی ہیں۔

۵۔ اولاد حافظ محمد لیس صاحب نے کل ۲۱ سالہ ازدواجی زندگی گذاری۔ خداوند تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس عرصے میں میاں بیوی کے درمیان ایک مثالی محبّت اور رفاقت برقرار رہی۔ اس عرصے میں ان کے ہاں تقریباً ۹ اولادیں (سات لڑکے اور دو لڑکیاں) ہوئیں، جو سب کی سب ماشاء اللہ حیات ہیں، مزید تفصیل یہ ہے۔

۱۔ حافظ محمد اسماعیل صاحب سلمہ | حافظ محمد اسماعیل حافظ صاحب کی بڑی اولاد ہیں، انہوں نے اپنے والد ماجد سے قرآن مجید حفظ کیا اور کچھ ابتدائی کتب درسیہ پڑھیں۔ آج کل اپنے والد کی جگہ مسجد کے امام و خطیب، مدرسہ کاشف العلوم کے مدرس اور خاندان کے کفیل ہیں۔ وہ بحمد اللہ ایک صالح اور باصلاحیت نوجوان ہیں، خدا تعالیٰ ان کی عمر اور علم میں برکت عطا فرمائے۔

۲۔ زین العابدین سلمہ | حافظ زین العابدین حافظ صاحب کے دوسرے بیٹے ہیں۔ انہوں نے بھی قرآن مجید حفظ کر لیا ہے اور آج کل لاہور میں درسی کتب اور قراءت (سبعہ) پڑھ رہے ہیں۔

۳۔ ظفر احمد سلمہ | ظفر احمد بھی ماشاء اللہ صالح نوجوان ہے۔ گھر میں اپنے بھائی اور والدہ کے ساتھ رہتے ہیں۔

۴۔۷: لڑکے: (اعجاز احمد، عبد الرؤف، عبد القدوس، محمود حسن):

حافظ صاحب کے بقیہ تین بیٹے (اول الذکر کے سوا) گاؤں میں ہی قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں، جبکہ اول الذکر کام سیکھتے ہیں۔

۸۔ بڑی دختر | حافظ صاحب کی بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے وہ اپنے گھر میں خوش و خرم ہے۔

۹۔ چھوٹی دختر | حافظ صاحب کی چھوٹی بیٹی بھی شادی شدہ ہے اور اپنے نئے گھر میں خوش و خرم ہے۔

باب پنجم

حج بیت اللہ اور وفات حسرت آیات

حافظ صاحبؒ کو قدرت نے جن خصوصی انعامات سے نوازا تھا ۔ ان میں حج بیت اللہ کی سعادت بھی قابل ذکر ہے ۔ بہت کم خوش نصیبوں کو یہ سرزمین دیکھنے اور زیارت کرنے کا موقعہ ملتا ہے ، اس موقعہ کی دوسری سعادت یہ تھی ، کہ جس سال حافظ صاحب نے یہ سعادت حاصل کی وہ چودھویں صدی کا آخری سال تھا ۔ اس طرح حافظ صاحبؒ کو چودھویں صدی کے آخری سال میں کچھ لمحات اللہ تعالیٰ کے مبارک اور مقدس گھر میں گذارنے کا موقعہ ملا اور چودھویں صدی کے آخری سال میں جو پیشانیاں اللہ تعالیٰ کے حضور جوار حرم میں بارگاہِ خداوندی کے سامنے خم ہوئیں ، ان میں سے ایک ہمارے محترم حافظ صاحب مرحوم کی پیشانی بھی تھی جو بارگاہِ ربّ العالمین میں خاک آلود ہوئی اور پھر یہی سفر حج آپ کے آخری سفر کا ذریعہ اور بہانہ بھی بن گیا ، گویا حافظ صاحب کی بارگاہِ رحمت میں یہ حاضری اتنی پسند کی گئی کہ انہیں ہمیشہ کی حاضری اور دائمی حضوری کا جلد بلاوا آگیا اور سفر حج آپ کی "شہادت" اور بارگاہِ ربّ العالمین میں سرخروئی کا وسیلہ ثابت ہوا ۔ فَلِلّٰہِ الحمد والمنّۃ ۔

سفر حج کی اس سعادت میں حافظ صاحب کی معیّت قصبے کے چند دوستوں ، حاجی غلام رسول ، حاجی عاشق اور ملک محمود صاحب وغیرہ نے کی ۔ انہوں نے اپنے فارم پُر کیے اور حکومت کے ہاں داخل کرا دیے ۔ اس بار قضا و قدر نے ان کی حاضری کا ویزا جاری کر دیا ہوا تھا ۔ اس لیے حکومت کے کارپردازوں کو انکار کرنے کی مجال نہ ہوئی ۔ اس طرح حافظ صاحب

نے صدہا مسرتوں کے ساتھ اپنی مولا کے در پہ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۰ء کے بعد حکومت کی طرف دعوت آگئی اور آپ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ خوشی خوشی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ روانگی ۱۰ ستمبر ۱۹۸۰ء۔

کراچی سے ہوائی جہاز کا سفر شروع ہونا تھا۔ کراچی ہی وہ شہر تھا، جہاں سے حافظ صاحبؒ نے اپنی تعلیم کا سفر شروع کیا تھا اور اب سفر حج شروع کرنے والے تھے۔ فضائی ذریعے سے سفر حج کرنے والے حاجی کراچی ہی سے احرام باندھ کر روانہ ہوتے ہیں، سو حافظ صاحب مرحوم نے بھی "ان سلے سفید لباس" پہن لیا اور لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْک ۔اے اللہ میں حاضر ہوں کی تکبیر اور تلبیہ کی صدائیں بلند کر کے اس گروہ میں شامل ہو گئے، جن پر باری تعالیٰ اپنے فرشتوں کے سامنے اظہار تفاخر فرماتے ہیں۔

ہوائی سفر ختم ہوا تو موٹر کا سفر شروع ہوا۔ یوں حافظ صاحب ایام حج شروع ہونے سے کافی دن پہلے بخیر و عافیت وادی مکہ میں پہنچ گئے۔ جی بھر کر مقامات مقدسہ کی سیر کی۔ طواف کیے، دعائیں مانگیں اور دل کی دیرینہ آرزوئیں اور تمنائیں پوری کیں۔

دورانِ حج چوٹ لگنا اور حافظ صاحب کا مجروح ہونا چونکہ چودھویں صدی کا یہ آخری حج تھا، اسی بنا پر اس سال عام سالوں کی نسبت زیادہ رش تھا۔ لوگ تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے۔ گو ابھی ذوالحجہ شروع نہیں ہوا تھا، مگر خانہ کعبہ کے "طواف" کے لیے ابھی سے رش شروع ہو گیا تھا۔ حجاج کے قافلے جوق در جوق مکہ مکرمہ پہنچ رہے تھے اور خانہ کعبہ کے طواف کے لیے ہر چہرہ بیتاب اور بیقرار نظر آتا تھا۔

خانہ کعبہ کے طواف کا منظر "شمع و پروانہ" کے عشق و سرمستی کا منظر پیش کرتا ہے۔ ان سلے لباس اور لمبے لمبے بالوں والے حاجی دیوانہ وار "بیت اللہ" شریف کا طواف کرتے ہیں اور یوں اپنے مولیٰ و آقا کے حضور اپنی دیوانگی و فریفتگی کے جذبے کا اظہار کرتے ہیں، جس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔

طواف کا ہر پھیرا "حجر اسود" سے شروع ہو کر اسی پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ سات پھیروں میں ہر پھیرے پر طائف (طواف کنندہ) حجر اسود کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اسے چومتا ہے یا کثرت ازدحام کے باعث استلام کرتا (انگلی یا چھڑی کا اشارہ کر کے اسے چومتا) ہے۔ اس موقع پر خوب دھکے لگتے ہیں اور ہر کوئی اس عشق و سرمستی میں دوسرے سے بازی لے جانا چاہتا ہے۔ اس دھکم پیل کے نتیجے میں بہت سے کمزور طبیعت لوگ گر کر زخمی ہو جاتے ہیں۔

حافظ صاحب جب طواف کرتے ہوئے حجر اسود کے سامنے پہنچے تو "جنت سے آئے ہوئے اس پتھر" کو دیکھ کر اسے چومنے کے لیے بیقرار ہو گئے، ہر چند دیکھ رہے تھے کہ اس تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، مگر ان کے عشق و سوزِ دروں نے انھیں اسے چومنے کے لیے بیتاب کر دیا۔ چنانچہ وہ بھیڑ میں جا پہنچے جو اسی مقصد کے لیے حجر اسود کے سامنے جمع تھی۔

پھر وہ قدم بقدم اس کے قریب تر ہوتے گئے اور جذبۂ شوق تیز تر ہوتا چلا گیا، مگر ابھی اس تک آپ کا ہاتھ پہنچا تھا اور نہ منہ کہ حبشیوں کا ایک غول دھکے دیتا اور کمزوروں کو روندتا ہوا آگے بڑھا۔ حافظ صاحب کو ان زور آور حبشیوں نے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ سبحان اللہ کعبہ شریف کی دیواروں کے عین نیچے، حجر اسود کے بالکل سامنے، خدا کا ایک بندہ، قرآن مجید کو اپنے سینے میں تھامے ہوئے نیچے گرا پڑا تھا اور لوگ اسے روندتے ہوئے گذر رہے تھے۔ حافظ صاحب کی زبان پر اس وقت بھی کلمات تکبیر جاری تھے۔ گویا حافظ صاحب زبان حال سے پکار رہے تھے۔

بجرم توام می کشند غوغا ئیست — تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ئیست

(تیری محبت کے جرم میں لوگ مجھے مار رہے ہیں اور شور برپا ہے اے محبوب تو بھی بام پر آ کر دیکھ کر کتنا عمدہ تماشا ہو رہا ہے)۔

چند لمحے آپ پر قیامت ڈھا گئے۔ کچھ ہوشمندوں نے دھکے دینے والوں کو ادھر ادھر کر کے حافظ صاحب کو زمین پر سے اٹھایا اور ہسپتال پہنچا دیا۔ ڈاکٹروں نے معاینہ اور ایکسرے وغیرہ دیکھنے کے بعد رائے دی کہ اس عاشق صادق کی ایک طرف کی پسلیاں عشق صادق کی نذر ہو کر خم کھا گئی یا ٹوٹ گئی ہیں۔ اس عاشق صادق کی زبان پر اس وقت بھی تکبیرات جاری تھیں اور ادھر ہسپتال میں ایسے ہی "کشتگان خنجر تسلیم" مسلسل آرہے تھے، اسی لیے انہوں نے حافظ صاحب کی پسلیوں پر پلستر چڑھا کر انہیں رخصت کر دیا۔ چنانچہ بقیہ مناسکِ حج حافظ صاحبؒ نے اسی تکلیف اور درد والم کی کیفیت میں انجام دیے۔ (۲۰۔ ذیقعدہ ۱۴۰۰ھ / یکم اکتوبر ۱۹۸۰ء)

جب وطن عزیز واپسی ہوئی تو پسلیوں پر سے پلستر اتر چکا تھا، مگر تکلیف بدستور تھی۔ اہل قصبہ کو جب حافظ صاحب کی واپسی کا علم ہوا تو قصبے کے لوگ بہت بڑی تعداد میں لاہور اسٹیشن پہنچ گئے اور والہانہ استقبال کر کے حافظ صاحب کو کوٹ پنڈی داس لے گئے۔ (۲۸ - ۲۹ ذوالحجہ ۱۴۰۰ھ / ۸ نومبر ۱۹۸۰ء)

بیماری اور وفات

ہر انسان پر وہ لمحہ جلد یا بدیر ضرور آتا ہے، جسے موت سے تعبیر کیا جاتا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (القرآن)

ہر متنفس نے موت کا مزہ چکھنا ہے۔

لیکن کسی کے لیے یہ موت پیغام قضا ہوتی ہے اور کسی کے لیے زندگی کے جیل خانہ سے چھوٹ کر اپنے محبوب حقیقی کے دیدار و وصل کا پیام جان آفریں۔ الغرض موقعہ اور سانحہ ایک ہی ہے، لیکن انسانوں کے تفاوت سے اس کی حیثیت بدل جاتی ہے، حافظ صاحب کے لیے بھی یہ موت نوید وصل اور بشارتِ لقا تھی، اسی لیے وہ اپنے ربّ

کے گھر کی زیارت کے لیے گئے تھے کہ قدرت نے انھیں اپنے دیدار و ملاقات کے لیے جلد اپنے پاس بلالیا۔

حافظ صاحب کو طواف کے دوران میں جو چوٹ لگی تھی، وہی چوٹ اُن کی وفات کا ظاہری سبب بن گئی، یوں جب موت آنے لگتی ہے تو بغیر سبب کے بھی آجاتی ہے ملے آنے اور اپنا شکار کھیلنے سے کون روک سکتا ہے، عربی شاعر متنبیؔ نے کیا خوب کہا ہے،

نعدّ المشرفية والعوالي ۔ وتقتلنا المنون بلاقتال

ہم تیز دھار تلواریں اور نیزے تیار کرتے ہیں ۔ مگر موت بغیر لڑے ہمیں قتل کر دیتی ہے

حافظ صاحب جب وطن واپس تشریف لائے تو بیماری دل (محبّت وعشق الٰہی) کے ساتھ ساتھ اپنے پہلو کے مسلسل درد کو بھی اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اس تکلیف میں دو تین مہینے گذر گئے۔

حافظ صاحب خود بھی یونانی و دیسی طریق علاج سے واقف تھے، اس مقصد کے لیے انہوں نے باقاعدہ طبابت کا کورس پڑھا تھا، اور سند حاصل کی تھی۔ چنانچہ اس بیماری کا بھی وہ اپنی سمجھ کے مطابق خود ہی علاج معالجہ کرتے رہے؛ بعد ازاں ایک اور تکلیف شروع ہوگئی۔ کہ پیٹ میں مسلسل درد رہنے لگا۔ علاج معالجہ جاری تھا، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، کے بمصداق دن بدن ان کی تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ تمام جسم، بالخصوص زیر ناف حصے پر ورم آگیا بعض احباب کے مشورے پر انھیں شاہدرہ کے ایک حکیم صاحب کو دکھایا گیا، انہوں نے دوا بھی دی، مگر اس سے بھی افاقہ نہ ہوا۔

ہسپتال میں داخلہ جب دیسی علاج کارگر نہ ہوا تو مخلص دوستوں نے انھیں گنگا رام ہسپتال (جنرل میڈیکل وارڈ) میں داخل کروا دیا۔ اس جگہ حافظ صاحب تقریباً پندرہ دن رہے اور ان کا علاج معالجہ ہوتا رہا۔ بہت سے ایکسرے اور دیگر ٹیسٹ لینے

کے بعد ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ حافظ صاحب کو (غالباً معدے کا) کینسر ہے۔ مگر اس کے باوجود حافظ صاحب نے حوصلہ اور ہمّت نہ ہاری۔

ہسپتال میں داخلے کا تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ حافظ صاحبؒ نے اپنے عزیز شاگرد حافظ شبیر احمد صاحب کو راقم الحروف کے بلانے کے لیے بھیجا۔ راقم الحروف کو حافظ صاحب کی بیماری اور ان کے ہسپتال میں داخلے پر بہت تشویش ہوئی۔ اسی دن خدمت میں حاضری دی۔ حافظ صاحب گنگارام ہسپتال میں ایک چھوٹے سے کمرے میں، جہاں ان کے علاوہ دو تین مریض اور بھی تھے، کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔ راقم الحروف کو دیکھ کر بڑی محبت و شفقت کا اظہار کیا۔

راقم الحروف نے حافظ صاحبؒ کو بڑی بڑی مشکلات میں بھی گھبراتے ہوئے نہ دیکھا تھا، مگر اس موقع پر یہ دیکھ کر بڑی حیرانگی ہوئی کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوئے بیٹھے ہیں۔ ہر چند انھیں تسلی و تشفی دی، مگر لگتا تھا انہیں وہ کچھ نظر آ رہا ہے، جو ہمیں نظر نہیں آتا۔ اب سوچتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ کیوں نہ ان کی بات پر یقین کر لیا اور کیوں نظر بھر کر انکی زیارت کا لطف نہ اٹھا سکا۔

دو دن کے بعد دوبارہ زیارت ہوئی اور ان کو مزید کمزور پایا، مگر اس وقت حالت اتنی تشویشناک نہ تھی اور ڈاکٹروں نے ابھی کینسر کی تشخیص نہ کی تھی، اس لیے انکی زندگی کے متعلق ہر کوئی پُر امید تھا۔

ہسپتال میں خدمت کرنے والے احباب | حافظ صاحب کی آخری بیماری میں یوں تو آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، تمام دن ہسپتال آنے جانے والوں سے بھرا رہتا تھا۔ مگر اس بیماری میں حسبِ ذیل افراد نے خصوصی طور پر حافظ صاحب کی خدمت و تیمار داری کی:

۱۔ **حافظ احمد علی** | حافظ احمد علی صاحب حافظ صاحب کے شاگرد، ان کے تربیت یافتہ اور ان کے

نسبتی بھائی ہیں ۔ حافظ صاحب کے ساتھ تمام زندگی بڑی نیاز مندی اور سعادت مندی کے ساتھ منسلک رہے ۔ آخری دن وہ حافظ صاحب کے کہنے پر گھر چلے آئے تھے ۔

۲ ۔ مولوی علم دین ، سندھی | حافظ صاحب کے نہایت عقیدت مند اور مخلص دوست تھے ، اس بیماری کے دوران اوّل سے آخر تک تیمارداری میں پیش پیش رہے اور حافظ صاحب کی دعائیں حاصل کیں ۔ ۳ ۔ قاری خلیل احمد صاحب ۔ ۴ ۔ حافظ امین صاحب ۔

۵ ۔ بھائی احسان | بھائی احسان اللہ صاحب بھی حافظ صاحب کے مخلص ساتھیوں اور دوستوں میں سے تھے ، انہوں نے بھی دوران بیماری حافظ صاحب کی بڑی خدمت کی ۔

۶ ۔ حافظ شبیر احمد صاحب | مولانا حافظ و قاری شبیر احمد صاحب حافظ صاحب کے خصوصی شاگرد ، ان کے رفیق و صلاح کار اور ان کے خصوصی معاون تھے ، ہر وقت ساتھ رہتے ۔ بیماری میں بھی اکثر آنا جانا رہا ۔ نماز جنازہ بھی انہوں نے ہی پڑھائی ۔

ہسپتال سے گھر واپسی | بالآخر بیماری میں افاقے کے بجائے شدت پیدا ہوتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ، کہ لیٹ کر اٹھنا محال اور مشکل ہو گیا ۔ کھانے پینے اور حوائج ضروریہ کی تکمیل میں دشواری پیش آنے لگی ۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے حافظ صاحب مرحوم نے اپنے تیمارداروں کو زور دے کر فرمایا کہ گھر لے چلو ۔ کچھ دوستوں نے پس و پیش کی ، اس پر کہا کہ " میری بات مانو ایسا نہ ہو کہ تمہیں میری لاش لے جاتے ہیں وقت ہو " ۔ حافظ صاحب چاہتے تھے کہ جب موت آنی ہی ہے تو ہسپتال کے بجائے گھر کیوں نہ آئے ، جہاں وہ اپنے یتیم ہونے والے بچوں کے سر پر آخری بار اپنی شفقت اور محبت والا ہاتھ پھیر سکیں ۔ جہاں وہ اپنی اکیس سالہ رفاقت دینے والی وفادار بیوی کو آخری بار الوداع کہہ سکیں ۔ جہاں وہ اپنے بزرگوں سے آخری بار کہا سنا بخشوا سکیں ، جہاں انہوں نے ساری زندگی قرآن و حدیث کا درس دیا تھا ، وہاں وہ ایک بار پھر دیکھتی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ واپس لوٹ سکیں اور اپنے ہاتھوں سے تعمیر کردہ مسجد پر آخری حسرت بھری نظر ڈال سکیں ۔

تیمار داروں نے حافظ صاحب کے انہی استادوں سے فون پر مشورہ لیا جن سے وہ تمام زندگی مشورہ لیتے رہتے تھے۔ ان کی رائے یہی تھی کہ بات مان لی جائے۔ چنانچہ حافظ صاحب کی رائے اور مرضی کے مطابق انہیں گھر واپس لے جایا گیا۔

افاقۃ الموت عام طور پر مریضوں کو مرنے سے پہلے کچھ افاقہ سا محسوس ہونے لگتا ہے یہ افاقہ اس گہری خاموشی کی مانند ہوتا ہے جو کسی طوفان آنے سے پہلے چھائی ہوتی ہے بہر حال حافظ صاحب واپس پہنچے تو دیکھنے والوں نے ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ دیکھا، مگر یہ ٹھہراؤ دراصل موت سے پہلے کا ٹھہراؤ تھا۔ حافظ صاحب کو اس وقت اپنی موت کا پورا پورا یقین ہو چکا تھا، اسی لیے انہوں نے اپنے گھر کے سامان سے لے کر قبر اور نماز جنازہ تک کی ہدایات اور وصایا اپنے دوست احباب کو فرما دیں، مگر اس کے ساتھ دوسرے تیمار داروں کو رخصت کر دیا اور صرف اپنے عزیز حافظ احمد علی کو اپنے پاس رہنے دیا۔

وفات سے دو روز قبل رات کے دس بجے اُن کی صحت دوبارہ بگڑ گئی! چہرے پر سوزش آگئی اور بار بار غشی کے دورے پڑنے لگے۔ رات اور اگلا دن اسی حالت میں گذر گئے۔ اگلی رات تکلیف اور بڑھ گئی اور صبح کے وقت جسم پر ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

اسی حالت میں حافظ صاحب کے شاگرد اور مدرسہ میں ان کے رفیقِ کار حافظ شبیر احمد تشریف لائے، تو حافظ صاحب نے ان سے رندھی ہوئی آواز میں فرمایا کہ "ہم نے کچھ عرصہ مل کر وقت گذارا ہے۔ اس دوران اگر مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو معاف کر دینا، کیونکہ میرا کچھ پتہ نہیں"۔ آپ کی یہ بات سن کر سب کو آپ کی وفات کا یقین ہو گیا۔

سورج طلوع ہوا تو زبان رکنے لگی۔ حافظ صاحب نے ذکر الٰہی شروع کر دیا۔ کلمہ طیبہ بار بار پڑھتے رہے۔ جب یہ خبر گاؤں میں پھیلی تو گاؤں میں ہلچل بپا ہو گئی، حافظ صاحب کے ہزاروں عقیدت مند جوق در جوق ان کے مکان پر جمع ہو گئے۔ ہر کوئی پریشان اور متحیر دکھائی دیتا تھا۔

اس موقع پر بعض لوگوں کا مشورہ ہوا کہ حافظ صاحب کو دوبارہ ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے، مگر حافظ صاحب نے سختی سے منع کر دیا۔ اس موقع پر قصبہ مذکورہ کے چیئرمین چوہدری منظور احمد صاحب بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے رائے دی کہ حافظ صاحب کو امریکن ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے، جہاں علاج معالجے کی بہتر سہولتیں حاصل ہیں۔ حافظ صاحب کے کان میں بھنک پڑی تو فرمایا کہ مجھے غیر مسلم ہسپتال میں ہرگز داخل نہ کرانا۔ مگر اس وقت محبّت اور عقیدت کا غلبہ تھا، ان کی بات پر کسی نے دھیان نہ دیا اور انھیں زبردستی اٹھا کر امریکن ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ زندگی میں یہ آخری تکلیف تھی جو انھیں ان آخری لمحات میں اٹھانا پڑی۔ کاش اس وقت ان کی بات پر غور کر لیا جاتا۔

امریکن ہسپتال میں موت وحیات کی کشمکش | جس وقت انھیں ہسپتال لایا گیا۔ اس وقت بھی زندگی کی رمق برائے نام تھی اور یہ رمق بھی اب کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی حافظ صاحب ہسپتال میں پہنچائے گئے۔ حضرت عزرائیلؑ اپنے ساتھ جنت کی خوشبو اور لقائے ربّی کا پیغام لے کر پہنچ گئے۔ اس طرح موت وحیات کی کشمکش عروج پر پہنچ گئی۔ ایک طرف ڈاکٹروں کی جماعت زندگی بچانے میں مصروف تھی، کوئی انجکشن لگا رہا تھا، کوئی آکسیجن دے رہا تھا، کوئی دعا مانگ رہا تھا اور دوسری طرف فرشتوں کی جماعت جان نکالنے میں مشغول تھی۔ تیمارداروں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں اور نگاہیں آسمان پر تھیں۔

بالآخر رات کے آٹھ بجے ڈاکٹروں کی جماعت زندگی کی بازی ہار گئی اور فرشتوں کی جماعت حافظ صاحب کی روح مبارک کو جنت کے حریر و دیباج میں لے کر فضاؤں میں اڑ گئی، تاکہ جلد از جلد ان کو علیّین کے مقام پر منتقل کر دیں۔ اس طرح رات گئے آپ کی تنہا لاش کو واپس گاؤں میں لے جایا گیا (۱۸ رجب ۱۴۰۱ھ / ۲۳ مئی ۱۹۸۱ء)

جنازہ اور کفن دفن | اگلی صبح موضع کوٹ پنڈی داس کے لیے سخت بھیانک تھی،

پورے قصبے میں کہرام مچا ہوا تھا، ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہر دل سوگوار تھا۔ انھیں قصبے کے ویران ہو جانے کا افسوس تھا، انھیں ایک عالم کے اٹھ جانے کا افسوس تھا، انھیں ایک مسجد اور مدرسہ کی بے آبادی کا سوگ تھا۔ اس دن قصبہ کی ایک دوکان بھی نہ کھلی۔ تمام مساجد میں حافظ صاحب کی نمازِ جنازہ کا اعلان ہوتا رہا۔ کچھ آدمی لاہور پہنچے اور یہاں ان کے جو شاگرد تھے، انھیں یہ المناک خبر سنائی۔ اردگرد کے گاؤں اور مواضع سے آنے والوں کا تانتا الگ بندھا ہوا تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب جنازہ اٹھایا گیا، ایک ایسے عالم کا جنازہ جس کی آواز سے لوگوں کو ایمان کی تازگی اور حیات نو ملا کرتی تھی۔ اس جنازے میں اتنا بڑا مجمع تھا کہ موضع کوٹ پنڈی داس میں آج تک کسی جنازے پر اکٹھا نہ ہو سکا تھا، اندازاً چھ ہزار کے قریب نفوس نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔ ان میں حافظ صاحب کے خاص دوست قاری محمد خلیل صاحب اور لاہور کے بہت سے علما و حفاظ اور قرا بھی تھے۔ نیز حضرت مولانا محمد صابر صاحب خلیفہ مجاز شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے شرکت کی۔

نماز جنازہ حافظ شبیر احمد صاحب نے پڑھائی اور اس آفتاب علم و فضل کو قبر کی لحد میں اتار دیا گیا۔

ع آسمان تیری لحد پہ گل افشانی کرے

اَللّٰھُمَّ اغفرلہٗ وارحمہٗ وادخلہٗ الجنّۃ۔

باب ششم

اخلاق وعادات

حافظ محمد لیس صاحب کرنالویؒ نے لاہور وکراچی کے بہترین مدارس میں اپنے وقت کے جید علمائے کرام سے تعلیم پائی تھی اور زندگی کا بہترین حصہ، تقریباً ۲۰ سال حصول تعلیم کی کوششوں میں صرف کیا تھا، انہوں نے قرآن مجید کی تعلیم حافظ خیرالدین مرحوم، قاری محمد صدیق جیسے اساتذۂ فن سے، علوم وفنون مولانا محمد علی بلوچ، مولانا عبدالجلیل صاحب، مولانا عبید الرحمٰن صاحب کیمبلپوری، استاذ محمد یوسف عطیہ مصری، مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی مفتی محمد وجیہ صاحب، پروفیسر محبوب الٰہی صاحب اور مولانا الطاف الرحمان جیسے علماء سے اور حدیث مولانا محمد جمشید صاحب، مولانا محمد مالک کاندھلوی صاحب اور شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانیؒ سے پڑھی تھی اور ان حضرات کی خدمت میں رہ کر مذہبی وروحانی تربیت حاصل کی تھی، اسی بنا پر مجموعی طور وہ ایک پاکیزہ خصلت اور عمدہ اطوار واخلاق کے حامل تھے، اس مختصر سی تحریر میں ان کی تمام عادات واطوار کا بیان ممکن ہے اور نہ مقصود، اس لیے چند ضروری باتوں پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا، تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ جرأت وہمت | حافظ صاحب نہایت جری اور بہادر شخص تھے، انہوں نے حق گوئی اور ردّ بدعات میں ہمیشہ بڑی جرأت وبہادری کا مظاہرہ کیا۔ وہ مخالفین کے خلاف جو محاذ بھی کھولتے، تو پھر اس پر پوری طرح ڈٹ جاتے تھے، انہوں نے کسی محاذ پر کبھی پست ہمتی یا کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔

مخالفین کے خلاف وہ بعض اوقات "میدان" میں اکیلے رہ جاتے تھے، ایسے

حالات میں بعض اوقات ان کے مخلص ساتھی اور رفیق انہیں پیچھے ہٹنے کا مشورہ دیتے تھے، مگر انہوں نے کبھی اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا، بعض موقعوں پر انھیں مالی اور جانی نقصان بھی برداشت کرنا پڑا، مگر وہ اپنے موقف سے کبھی پیچھے نہ ہٹے۔

۲۔ مسلکِ حقہ کی طرف سے مدافعت حافظ صاحب کی نمایاں خصوصیت مسلکِ حقہ کی مدافعت میں سختی و شدت ہے۔ حافظ صاحب ہمیشہ اپنے مسلک کی حمایت میں شمشیر برہنہ رہے۔

۱۹۷۴ء میں پورے ملک میں قادیانی مرزائیوں کے خلاف طوفانی تحریک چلی، حافظ صاحب نے قصبے میں اپنی طوفانی تقریروں کے ذریعے اس محاذ کو جلا بخشی۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے زمانے میں وہ "سوشلزم" اور سوشلسٹوں کے خلاف کمربستہ رہے۔

ان کے زمانۂ حیات میں کفار کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں پر جو حملہ بھی ہوتا تھا، وہ اپنے خطبات کے ذریعے اس کا منہ توڑ جواب دیتے تھے۔

حافظ صاحب کے زمانے میں قصبے کے "ایک فرقے" نے پر پرزے نکالنے شروع کیے اور صحابہ کرامؓ پر طعن و تشنیع اور اپنے بغض باطن کا اظہار شروع کر دیا۔ اس وقت ان کے بااثر ہونے کی بنا پر، ان کے مقابلے کی کسی شخص کو جرأت نہ ہوتی تھی! اس محاذ پر حافظ صاحب اکیلے ہی آخر وقت تک ڈٹے رہے؛ جب محرم کا مہینہ آتا اور ان کی مجالس اہل قصبہ کو پریشان کرتیں، تو حافظ صاحب اپنے مکان پر لاؤڈ سپیکر لگا کر، مخالفین پر جوابی حملہ شروع کر دیتے اور یہ سلسلہ شیعی مجالس کے اختتام تک جاری رہتا؛ ایک مرتبہ ایک بااثر پارٹی نے حافظ صاحب پر قاتلانہ حملہ کر دیا، اس وقت حافظ صاحب گھر میں اکیلے تھے اور قصبے کا کوئی فرد بھی ان کے پاس موجود نہ تھا، مگر انہوں نے کمال پامردی سے دشمنوں کا مقابلہ کیا اور اپنے موقف پر قائم رہے۔

"صحابہ کرام" کی عظمت و تقدیس ان کا خاص موضوع تھا، انھیں بلاشبہ شمع رسالت

کے پروانوں سے بے لوث عشق تھا۔ وہ جب اس موضوع پر بولتے تو بولتے ہی چلے جاتے۔ انہیں نہ تھکاوٹ کا احساس ہوتا اور نہ سُستی کا۔

حافظ صاحب ہمیشہ "مسلک علمائے دیوبند" کے بھی محافظ رہے، جو قرآن و سُنّہ کے عین مطابق ہے، اسی لیے قصبے کے کچھ لوگ ان کے مخالف تھے، مگر حافظ صاحبؒ ہمیشہ ردّ بدعات اور تردید رسومات میں پوری لگن کے ساتھ کوشاں رہتے اور کسی کی ملامت و مخالفت کی پروا نہ کرتے۔

ردّ بدعات و تردید رسوم کے سلسلے میں حافظ صاحب نے قصبے میں ایک مفید سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک آدھ دن مختلف لوگوں کے گھروں اور حویلیوں میں جاکر "درس قرآن" دیتے تھے، ایسے موقعوں پر حویلی یا مکان پر لاؤڈ سپیکر بھی نصب کر دیے جاتے۔ اس طرح ان کے مواعظ سے گھروں کے لوگ اور گھریلو خواتین بھی مستفید ہوتی تھیں۔ ایسی مجالس میں موافق و مخالف دونوں طرح کے لوگ شمولیت کرتے تھے۔

ان مجالس میں حافظ صاحب اپنے دوستوں اور شاگردوں سے بھی تقریر کراتے تھے۔ چنانچہ ایک بار "راقم الحروف" کو بھی انہوں نے ایک حویلی میں تقریر کرنے کی دعوت دی، مگر راقم بوجہ اپنی مصروفیات کے تعمیلِ ارشاد نہ کر سکا۔

الغرض حافظ صاحبؒ باطل کے مقابلے میں ہمیشہ سینہ سپر رہتے تھے۔ وہ علاقے کے اہلِ حق کی عزت، ان کا وقار اور ان کی آبرو تھے۔ بقول حافظ محمد ایوب صاحب مدظلہ "وہ حق گو عالم تھے، افسوس اب قصبے میں کوئی ان جیسا نہ رہا"۔

۳۔ **منکرات پر روک ٹوک** حافظ صاحبؒ جس طرح باطل کے مقابلے میں سخت اور متشدد تھے۔ اسی طرح وہ منکراتِ شریعت پر گرفت کرنے اور روک ٹوک کرنے میں بھی کسی چھوٹے بڑے کا لحاظ نہ کرتے تھے، قصبے بھر میں اگر کوئی کام خلاف شرع ہوتا اور ان کو پتہ چل جاتا۔ تو وہ کسی کو معاف نہیں کرتے تھے۔ وہ حق گوئی میں نہ کسی سے ڈرتے

تھے اور نہ کسی سے دبتے تھے۔ ایسے موقعوں پر چونکہ ان کی گفتگو میں خلوص ہوتا تھا، اس لیے کوئی شخص بھی ان کا مؤاخذہ کرنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔

۴۔ احیائے سُنّت سے عشق | حافظ صاحب کو قصبے میں احیائے سُنّت سے بھی عشق تھا، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی احیائے سُنّت کا خیال رکھتے تھے۔

موضع کوٹ پنڈی داس (شاکر آباد) میں اکثر نکاح "مسجد" سے باہر ہوتے تھے۔ قصبے میں سب سے پہلے حافظ صاحب نے مسجد میں نکاح کا رواج ڈالا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"نکاح کا اعلان کرو اور نکاح مسجدوں میں کیا کرو۔" (الحدیث)

راقم الحروف کے چھوٹے بھائی (جن کی جواں موت خون کے آنسو رلاتی ہے، المتوفی ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء) کا نکاح حافظ صاحب نے ہی پڑھانا تھا، انہیں ہر چند "حویلی" میں آکر یہ کام انجام دینے کو کہا گیا، مگر باوجودیکہ دلہن حافظ صاحب کی بھتیجی زادبہن تھی، انہوں نے مسجد میں ہی نکاح پڑھایا۔ برادری میں دستور تھا کہ نکاح ہو جانے کے بعد دولہا کھڑے ہو کر تمام اہل مجلس کو سلام کرتا ہے۔ بھائی انور مرحوم نے بھی کھڑے ہو کر سلام کرنا چاہا، مگر حافظ صاحب نے بھری مجلس میں ٹوک دیا اور فرمایا کہ یہ خلافِ سنت ہے۔

چونکہ سُنّت ہے کہ مرد کی شلوار یا تہبند ٹخنوں سے اوپر ہو، اسی لیے خود حافظ صاحب کی شلوار ہمیشہ سُنّت کے مطابق ہوتی تھی اور دوستوں، شاگردوں میں سے اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا تو حافظ صاحب فوراً ڈانٹ دیتے تھے، راقم الحروف کی موجودگی میں ایک مرتبہ ایک عزیز ترین شاگرد کو اس "جرم" پہ ڈانٹ دیا تھا۔

شکل وصورت، وضع قطع اور لباس و پوشاک میں حافظ صاحب ہمیشہ "سُنّت" کے مطابق عمل کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنی مونچھیں نہیں بڑھائیں اور نہ کبھی داڑھی کو ترشوایا۔ لباس میں کرتہ شلوار آپ کو پسند تھا، راستے میں چلتے ہوئے سیدھے چلتے

تھے، دائیں بائیں دیکھنا ان کو سخت ناپسند تھا۔ چلتے وقت نگاہ ہمیشہ زمین پر رہتی تھی۔

اپنی برادری میں بدعات و رسومات کے پھیلنے پر انہیں ہمیشہ تشویش رہتی تھی۔ وہ سوم، ہفتم، دسواں اور چہلم وغیرہ کے سخت مخالف تھے۔ برادری میں سے اگر کوئی ان حرکات کا مرتکب ہوتا تو حافظ صاحب اس سے کبیدہ خاطر ہو جاتے تھے۔

۵۔ استغنار قدیم علما توکّل علی اللہ کا مظہر ہوتے تھے، اس وصف میں حافظ صاحب کو بھی قدرت نے حصّہ وافر دیا تھا۔ عام طور پر مسجدوں کے امام و خطیب اور مدارس کے استاد ان اداروں سے اپنی علیحدگی کو کسی صورت بھی گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ بزعم خویش وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی روزی اسی مسجد اور مدرسہ کے ساتھ متعلّق ہے۔ ہر قصبے اور ہر شہر میں اس قسم کی متعدّد مثالیں مل جاتی ہیں، مگر خدا گواہ ہے کہ مرحوم حافظ صاحبؒ نے کبھی بھی اس قسم کی پست ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب کبھی کوئی معاملہ ان کی طبیعت کے خلاف ہوتا۔ تو وہ فوراً اپنا استعفا پیش کر دیتے تھے، "جامع مسجد مدینہ" شاکر آباد کی خطابت و امامت کے اٹھارہ سالہ (۱۹۶۴ - ۱۹۸۱ء) زمانے میں کئی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا، کہ کسی شخص نے ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کی اور حافظ صاحبؒ نے جھٹ استعفا لکھ مارا لیکن چونکہ حافظ صاحب مخلص تھے اور اپنے شعبے میں کامیاب بھی تھے، اسی لیے لوگ ان کی منتیں کر کے ان کو منا کر لاتے تھے۔

"مدرسہ کاشف العلوم" کی تدریس کے زمانے میں بھی کئی مرتبہ اس قسم کے موقعے پیش آئے۔ حافظ صاحب کے "ذخیرۂ خطوط" میں ایک خط حافظ خیر الدین صاحب مرحوم (بلال پارک والوں) کا خاص اس عنوان پر ملتا ہے، جس میں وہ حافظ صاحب کو تاکید کرتے ہیں۔ کہ وہ مدرسہ کو چھوڑ کر نہ جائیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انہوں نے ایسا ارادہ کر لیا تھا؛

القصّہ حافظ صاحبؒ بڑے مستغنی طبیعت کے شخص تھے اور وہ کبھی دنیا داری کے چکر

نعتیں پڑھتے ۔

حسنِ انتظام حافظ صاحب کی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ بہترین منتظم بھی تھے ۔ انہوں نے اپنے عہدِ امامت میں مسجد کے دوران بہت ... جس عمدگی کے ساتھ مسجد کا انتظام چلایا اور مسجد کو دوبارہ وسعت دی ۔ اس سے حافظ صاحب کی انتظامی خوبیوں اور صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔

علاوہ ازیں حافظ صاحب ۱۹۶۲ء سے مدرسہ کی شعبۂ تعلیم شاہ آباد کے صدر مدرس ہی نہیں ، بلکہ اس کے منتظم بھی ہوتے تھے ۔ اس سترہ سالہ دورِ تدریس میں انہوں نے ہر کام کی خود نگرانی کی ، اور اس مدرسے کو نہایت کامیابی کے ساتھ منزل کی طرف گامزن کیا ۔

مدرسہ کے حسنِ انتظام اور حسنِ تدبیر کے ضمن میں چند باتیں بہت اہم ہیں : حافظ صاحب جب مدرسہ میں تشریف لائے ، اس وقت تمام اخراجات کی کفالت ناظم علی حسن صاحب اور ان کے دونوں بھائی کیا کرتے تھے ، جو اپنے تھوک کے کاروبار کی وجہ سے " تھوک والے " کہلاتے تھے ، قصبے کے دوسرے لوگ اس میں بہت کم حصہ لیتے تھے ۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال مدرسہ کے قیام و بقا کے لیے کچھ زیادہ مفید نہ تھی ، کیونکہ جن اداروں کی مالی سرپرستی معاشرے کے بجائے " افراد " کر رہے ہوں ان کا مستقبل غیر یقینی ہوتا ہے ۔ ان حالات میں حافظ صاحبؒ نے اپنے " مواعظِ حسنہ " کے ذریعے قصبے میں مدرسہ کی امداد کا جذبہ پیدا کیا اور " تھوک والوں " کے ساتھ ساتھ ، دیگر لوگ بھی اس کے اخراجات میں معاونت کرنے لگے ، یوں یہ مدرسہ ابھی تک کامیابی کے ساتھ منزل کی طرف گامزن ہے گو بعد میں بھی زیادہ خرچہ ناظم علی حسن صاحب ہی اٹھاتے رہے ۔

اس تعاون کی تحریک میں انھیں اس وقت اور بھی خوشی ہوئی ، جب گاؤں کے ایک لاولد زمیندار نے اپنا کئی ایکڑ رقبہ مدرسہ کے لیے وقف کر دیا ، جو اس وقت بھی مدرسہ کی آمدنی کا سب سے معقول ذریعہ ہے ۔

علاوہ ازیں انہوں نے مدرسہ میں عید کی نماز پڑھنے کی تحریک شروع کی جس کے باعث لوگوں کو مدرسہ دیکھنے اور اس کے تعاون میں حصّہ لینے کی رغبت پیدا ہوتی تھی۔

اس سلسلے کا تیسرا اہم اور مثبت پہلو یہ ہے کہ حافظ صاحب سے پہلے مدرسہ کے تمام بچے ایک ہی جگہ بیٹھتے اور ایک ہی جگہ پڑھتے تھے اگر اساتذہ کے درمیان مثالی رشتۂ اخلاص ہو اور ہر ایک کو ذمّہ داری کا احساس ہو تو پھر تو یہ "ٹیم ورک" ایک خوبی ہے۔ (جیسا کہ سابق اساتذہ میں یہ احساس موجود تھا) ورنہ یہ ذمہ داری سے جان چھڑانے کا بہت اچھا اور معقول بہانہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حافظ صاحب نے مدرسہ میں قدم رکھتے ہی بچوں کی تقسیم کر دی اور ہر استاد کو اپنے زیر نگرانی بچوں کی ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا۔ اس سے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت اثر پڑا۔

مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے والے بچوں کیلئے سند کا اجرا بھی اُن کی انتظامی صلاحیت کا مظہر ہے۔ انہوں نے مدرسہ کی باقاعدہ سندیں چھپوائیں اور کامیاب طلبہ کو یہ اسناد جاری کیں۔ مجھے یہ سند ۔ ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں ملی۔

حافظ صاحب کی انتظامی خوبیوں کا اس سے بہتر اور کیا ثبوت ہوگا کہ ان کے سترہ سالہ "دور تدریس" میں مدرسہ اور مسجد دونوں جگہ بڑی عمدگی کے ساتھ کام چلتا رہا اور چھوٹے موٹے واقعات کے علاوہ کوئی بڑا مسئلہ یا بحران پیدا نہیں ہوا۔

حافظ صاحب نے مدرسہ کی ملازمت سے کوئی ناجائز فائدہ یا مراعات بھی حاصل نہیں کی۔ وہ ہمیشہ گھر سے کھانا کھا کر جاتے اور واپس گھر میں آکر کھانا کھاتے تھے۔ انہوں نے مدرسہ کے مطبخ سے کبھی کھانا کھایا اور نہ اس کا غلط استعمال کیا۔

۷۔ حسنِ خطابت و حسنِ تقریر: اگر کوئی راقم الحروف سے پوچھے کہ حافظ صاحب میں سب سے بڑی خوبی کیا تھی؟ تو راقم کا جواب بلا تردّد یہ ہوگا کہ حافظ صاحب کی سو خوبیوں کے برابر خوبی یہ تھی کہ وہ "بہت کامیاب مقرر اور اعلیٰ درجے کے خطیب" تھے۔

ان کو قدرت کی جانب سے تقریر وخطابت کا خصوصی ملکہ عطا ہوا تھا۔

انہوں نے طالب علمی کے زمانے سے ہی وعظ کہنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ اوپر گذر چکا ہے کہ وہ شادی کے بعد ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک ہر سال رمضان المبارک میں موضع شاکر آباد میں چلے آتے تھے۔ یہاں وہ نماز تراویح میں قرآن مجید بھی سناتے اور نماز جمعہ کا خطبہ اور فجر کی نماز کے بعد ہر روز درسِ قرآن مجید بھی دیا کرتے تھے، اس وقت بھی باوجود طالب علم ہونے کے، ان کی تقریر کو سننے کے لیے لوگ دور دراز سے چل کر آتے تھے۔

فراغت کے بعد جب انہوں نے جامع مسجد مدینہ شاکر آباد کا چارج سنبھالا ان کی حسنِ خطابت اور حسنِ تقریر کی ہر طرف شہرت ہو گئی اور لوگ دوسری مساجد کو چھوڑ کر، درسِ قرآن سننے اور نماز جمعہ پڑھنے کے لیے اس مسجد کا رخ کرنے لگے۔ اس طرح مسجد تنگ ہو گئی، تو مسجد کو وسیع کیا گیا، مگر یہ وسیع شدہ مسجد بھی حاضرین کی کثرت کی وجہ سے چھوٹی نظر آنے لگی، اس پر مسجد کے لیے اور رقبہ حاصل کیا گیا، جس پہ حافظ صاحب کی وفات کے بعد ایک عالیشان اور وسیع مسجد تعمیر کی گئی ہے۔

باوجود اس بات کے کہ شاکر آباد (کوٹ پنڈی داس) کی مقامی بولی پنجابی اور انبالوی ہے۔ مگر حافظ صاحب ہمیشہ اردو زبان میں تقریر کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی تقریر میں اتنی آسان اور اتنی سہل اردو بولتے تھے کہ دیہات کے ان پڑھ لوگ بڑی آسانی کے ساتھ نہ صرف ان کی تقریر کو سمجھ لیتے تھے، بلکہ اس میں حد درجہ دلچسپی کا اظہار بھی کرتے تھے۔

اردو زبان سے ان کی محبّت ان کی تقریروں تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنی عام بول چال گھر اور نجی مجالس میں بھی اردو ہی بولتے تھے۔ شروع میں لوگوں کو ان کا یہ انداز کچھ اجنبی محسوس ہوا، مگر آہستہ آہستہ لوگ ان کی اس گفتگو کے عادی ہو گئے اور ان کا یہ انداز پورے قصبے میں بیحد مقبول ہوا۔

وہ اپنی تقریروں میں وعظ و نصیحت سے لے کر، فضائل، مسائل فقہی احکام، چھوٹی بڑی حکایات اور عمدہ علمی لطیفے تک بیان کرتے تھے، وہ دوران تقریر سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ رکھنے اور ان کی آخر تک دلچسپی قائم رکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہتے تھے۔ ان کی مجلس وعظ میں لوگ آتے تو تھے، مگر اٹھ کر جاتے بہت کم تھے۔ ان کی ان تقریروں کی وجہ سے لوگوں میں مسئلے مسائل کا علم اور چرچا پھیلا۔ ان کو نماز روزے سے لے کر گھریلو زندگی تک سب کے طور طریقے معلوم ہوئے۔

ان کی تقریریں اپنی اثر آفرینی کے اعتبار سے بھی بہت کامیاب تھیں۔ انہوں نے بہت سے لوگوں سے رسم و رواج چھڑوا دیے۔ کئی بے نمازی نمازی بن گئے اور متعدد داڑھی منڈانے والوں نے توبہ کرلی اور شرعی شکل و لباس کو اپنا لیا۔

ان کی تقریروں کو پردہ نشین عورتیں بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتی تھیں، انھیں بھی حافظ صاحب کی تقریروں سے بہت فائدہ پہنچتا تھا۔ الغرض افادہ و استفادہ کے لحاظ سے ان کی تقریریں کامیاب تھیں اور مؤثر و تیر بہدف بھی۔

ان کی تقریروں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی وفات پر ایک عرصہ گذر جانے کے باوجود قصبے میں ابھی تک ان کی تقریروں کے کیسٹ بڑی توجہ سے سنے جاتے ہیں۔ الغرض حافظ صاحب۔ ایک کامیاب مقرر اور خوش نوا خطیب تھے۔

۸۔ **یورپ میں تبلیغ اسلام کا شوق** حافظ صاحب کے سینے میں ایک ایسی خواہش بھی تھی، جو بس دل ہی دل میں رہ گئی اور اس کی تکمیل کی نوبت نہ آسکی۔ وہ خواہش یہ تھی کہ حافظ صاحب چاہتے تھے کہ وہ یورپ میں جاکر تبلیغ اسلام کا فرض ادا کریں۔

اس مقصد کے لیے حافظ صاحبؒ نے اپنے ایک واقف کار "ڈاکٹر محبت علی" صاحب کو جو امریکہ میں رہائش پذیر تھے، خط لکھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر حافظ صاحب کو ٹال دیا کہ وہ انگریزی زبان و ادب سے ناآشنا ہیں، حالانکہ اگر حافظ صاحب یورپ

ہیں چلے جاتے تو انگریزی زبان چند دنوں میں سیکھ سکتے تھے، حافظ صاحب مرحوم کا بھی یہی خیال تھا، مگر ڈاکٹر صاحب کو اصرار تھا کہ یہ وصف پہلے پایا جانا چاہیے، اس طرح یہ بات نہ بن سکی۔

۹۔ حافظ صاحب کی تدریس تقریر و خطابت کے علاوہ حافظ صاحب ایک کامیاب استاد اور معلم بھی تھے۔ مگر افسوس کہ ان کی تقریر و خطابت کے جوہر تو کھلے، مگر تدریس کا صرف ایک پہلو ہی سامنے آسکا اور وہ درجۂ حفظ کے طلبہ کی "تدریس و تعلیم" ہے، حافظ صاحب نے جب ۱۹۶۳ء کے اواخر میں جامع مسجد مدینہ کا انتظام سنبھالا، تو انہوں نے مدینہ مسجد میں ہی بچوں کی تعلیم شروع کر دی، بعد میں ان بچوں کو باہر کے مدرسہ میں منتقل کر دیا گیا اور حافظ صاحب نے تقریباً ۱۰ سال مدرسہ کاشف العلوم میں درجۂ حفظ کے بچوں کو پڑھایا۔

حافظ صاحب کی تمنا تھی کہ وہ اس مدرسے کو وسعت دیں اور مدرسہ میں طلبہ کو تدریسی کتب بھی پڑھائیں، مگر وسائل کی قلت کی بنا پر اس پروگرام پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ اگر زندگی ان سے وفا کرتی، تو شاید وہ موضع کوٹ پنڈی داس کے مذکورہ مدرسے کو ایک وسیع جامعہ میں تبدیل کر دیتے۔

۱۰۔ حسن قراءت حافظ صاحب باقاعدہ قاری نہ تھے، کیونکہ انہوں نے کسی جگہ سے باقاعدہ قراءت کا فن نہیں سیکھا تھا، مگر اس کے باوجود جب، وہ سادگی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو وہ قاریوں کو بھی مات کر جاتے تھے۔ ان کے لہجے میں ایک وقار اور متانت تھی، وہ قرآن مجید پڑھتے وقت نہ منہ کو ٹیڑھا کرتے اور نہ "تحت الثرای" سے قاریوں جیسی پر تکلف آوازیں نکالتے، مگر اس کے باوجود جب وہ قرآن پڑھتے، تو لوگ نہایت توجہ کے ساتھ ان کا قرآن مجید سنا کرتے تھے۔ الغرض وہ قرآن مجید کی تلاوت میں بھی منفرد اسلوب کے حامل تھے۔ اسی بنا پر رمضان المبارک میں ان کی مسجد میں دوسری مساجد کی

نسبت زیادہ رش ہوتا تھا۔

۱۱۔ عزیزم حافظ احمد علی کا اظہار خیال

"جب میں نے مدرسہ اسلامیہ کاشف العلوم میں پڑھنا شروع کیا تو اس وقت میری عمر دس برس تھی اور میرے استاد حضرت مولانا محمدؒ الیاس مرحوم تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ جو حسن سلوک کیا، اس سے میں بیحد متاثر ہوا۔ میں تعلیم کے دوران میں زیادہ تر حافظ صاحبؒ کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ چھٹی کے بعد حافظ صاحبؒ کے ساتھ ہی گھر چلا جاتا، کیونکہ وہ نہ صرف میرے استاد تھے، بلکہ میرے رشتہ دار (بہنوئی) بھی تھے۔ حافظ صاحب کا مجھ سے سلوک ایسا تھا کہ اکثر (ناواقف) لوگ مجھے ان کا بیٹا تصوّر کرتے تھے۔ میرے علاوہ بھی جو شاگرد ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ اس کو بھی اپنے عزیزوں جیسا خیال کرتے تھے۔ طالب علموں کے ساتھ مدرسہ میں شاگردوں جیسا، مگر گھر میں بھائیوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ غریب طالب علموں کی اپنی جیب سے مدد کرتے۔ مدرسہ میں کوئی کمی محسوس ہوتی تو وہ اپنی جیب سے پوری کرتے تھے۔ آخری دنوں میں کوئی شخص بھی، اپنے دوستوں اور عزیزوں میں سے ایسا نہ چھوڑا، جسے گھر بلا کر کہا سنا نہ بخشوایا ہو، خواہ وہ شخص حافظ صاحب سے کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہوتا، طبیعت ذرا سخت قسم کی تھی اور حق بات کہنے سے کبھی نہ گھبراتے۔ حق کا مسئلہ کھول کر اور واضح طور پر بیان کرتے۔ خواہ کسی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ان کا مقصد ہمیشہ اصلاحی ہوتا تھا، کسی پر تنقید یا دل آزاری کبھی نہ کرتے تھے۔

مدرسہ کے طالب علموں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ خاص طور پر نماز اور لباس و وضع قطع پر گہری نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کا شاگرد فارغ ہو کر گھر جاتا تو وہ نماز کا پابند ہو کے جاتا تھا۔ راستے میں چلتے ہوئے ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرتے اور سلام میں ہمیشہ پہل کرتے، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت ان کی زندگی کا اصول تھا۔ شاگردوں، دوستوں اور دوسرے احباب سے میل جول رکھنا اور خط و کتابت

کے ذریعے ان کے ہر دکھ درد میں شریک ہونا ان کا شیوۂ زندگی تھا۔ وہ اپنے استادوں کی بھی خدمت کرتے اور ان کی خدمت میں تحائف بھیجتے اور شاگردوں کو تحفے میں کتابیں مرحمت فرماتے۔ اس لیے ان کے تمام اساتذہ ان سے خوش تھے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مدرسہ کے معاملات میں جب بھی کسی مشکل کا سامنا ہوتا تو وہ اپنے استاد حافظ خیر دین (بلال پارک لاہور) سے مشورہ لیتے، ان کی وفات کے بعد دوسرے استاد قاری محمد صدیق صاحب سے مشورہ لیتے تھے! اسی طرح حافظ صاحب اپنے ہر ملاقاتی کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور ان سے نہایت محبّت کے ساتھ ان کی خیر خیریت دریافت کرتے۔ اگر ان کی کوئی ضرورت ہوتی تو آپ ممکن حد تک اس کو پورا کرنے کا اہتمام فرماتے۔

انہیں "مہمان نوازی" کا بھی بہت شوق تھا، مہمان کی خاطر مدارات کے علاوہ اسے دور تک رخصت کرکے آتے، اسی لیے ان کا ہر مہمان ان کے اخلاق و محبّت سے متاثر ہو کے جاتا تھا، انہوں نے اپنی زندگی میں سادگی اپنائے رکھی۔ سادہ لباس پہنتے، ہلکا پھلکا کھانا کھاتے، سادہ رہن سہن اختیار کرتے، الغرض ان میں وہ تمام اوصاف موجود تھیں جو ایک اچھے عالم میں موجود ہونی چاہئیں، وہ علم اور عمل دونوں کا مجسّم نمونہ تھے۔ (احمد علی)

اختتام القصّہ حافظ صاحب کی ذات بڑی خوبیوں اور اوصاف جمیلہ کا مجموعہ تھی، ان جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے۔ ان کی زندگی میں ممکن ہے کچھ لوگوں کو ان سے اختلاف رہا ہو اور اس بنا پر وہ سطور بالا کو مبالغے پر محمول کریں، لیکن وہ شاید حافظ صاحب کے خلوص، تقویٰ اور سادگی کے ضرور معترف ہونگے اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی ہر بات میں خلوص ہوتا تھا، ان کی ذات سے اہل قصبہ کو بڑی تقویت حاصل تھی، ان کی وفات سے کمبوہ برادری اور موضع شاکر آباد (کوٹ پنڈی داس) دونوں ایک بلند مرتبہ عالم، ایک اچھے مقرر اور خوش بیاں خطیب سے محروم ہو گئے ہیں۔ خدا تعالیٰ حافظ صاحب مرحوم کو اعلیٰ درجات نصیب فرمائے آمین۔

ضمیمہ

ابنائے (فضلائے) مدرسہ کاشف العلوم. کوٹ پنڈیداس

اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ مدرسہ کاشف العلوم، کوٹ پنڈی داس کا قیام ۱۹۶۱ء میں عمل میں آیا، مگر حفظ قرآن کی تکمیل کا سلسلہ ۱۹۶۳ء سے شروع ہوا۔ راقم الحروف کو ہی مدرسہ کاشف العلوم کے اوّلین حافظ قرآن مجید ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ حافظ محمد الیاس صاحبؒ کی مدرسہ میں تشریف آوری (۲۰ ستمبر ۱۹۶۴ء) تک فارغ التحصیل طلبہ کا کوئی ریکارڈ وغیرہ موجود نہ تھا۔ حافظ صاحبؒ نے ہی اس کارِ خیر کی ابتدا کی اور مدرسہ کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے اسناد کا اجرا کیا۔ اس مقصد کے لیے حافظ صاحب نے ایک رجسٹر بنایا، جو صدر مدرس کی حیثیت سے ہمیشہ ان کی ہی تحویل میں رہتا تھا۔ اس رجسٹر کے آغاز میں "پیش لفظ" کے طور پر حافظ صاحب نے تحریر فرمایا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہٖ الکریم۔ امّا بعد الحمد للہ مدرسہ اسلامیہ کاشف العلوم کوٹ پنڈی داس ضلع شیخوپورہ پاکستان، جس کا آغاز ۱۹۶۱ء سے خدمت قرآن پاک سے ہوا۔ احقر نے ۲۰ ستمبر ۱۹۶۴ء کو مدرسہ کا تعلیمی نظام سنبھالا تو یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ جو طلبہ بھی حفظ سے فراغت حاصل کریں ان کا نام مع پتہ الگ کاپی میں درج کیا جائے۔ تاکہ کل حفاظ کا علم رہے کہ کتنے طلبہ مکمل فیض یاب ہو کر مدرسہ سے رخصت ہوئے۔ اس کاپی میں صرف ان حفاظ کا نام درج ہوگا جن کے ختم قرآن کی دعا اس مدرسہ میں کی گئی۔ جو حافظ کسی اور مدرسہ میں ختم کر کے صرف دور کے لیے اس مدرسہ میں داخل ہوگا۔ اس کا

نام صرف رجسٹر حاضری میں درج ہوگا۔ اس کا پی میں درج نہیں کیا جائے گا۔ یادداشت کے لیے ہر حافظ کے نام والے خانہ میں اس اُستاد کا نام بھی درج کر دیا ہے، جن سے حفظ کیا ہے، سند فقط ان حفاظ کو ملے گی جو پورے قرآن مجید کا امتحان دیں گے۔

احقر محمد لیس کرنالوی، مدرس مدرسہ ہذا

مہر

مدرسہ اسلامیہ کاشف العلوم

اساتذہ کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ مدرسہ کاشف العلوم میں بیک وقت دو دو اُستاد تعینات رہے۔ اس لیے متعلقہ خانے میں کسی اُستاد کا نام دیکھ کر یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ فقط اسی استاد کا شاگرد ہے، اس لیے کہ ہر طالب علم کو دونوں اساتذہ سے پڑھنے کی نوبت آتی تھی۔ علاوہ ازیں مدرسے کا ہر استاد مدرسہ کے ہر طالب علم کا استاد ہی ہوتا ہے۔ اس تمہید کے بعد حافظ محمد لیس صاحب کی وفات تک کے فضلائے مدرسہ کی فہرست حسب ذیل ہے:

نمبر شمار	نام و ولدیت	پتہ بوقت حفظ قرآن	استاد	سال اختتام	موجودہ کیفیت
١	حافظ محمود الحسن عارف ولد عمر دین	ایچوگل، ضلع لاہور	حافظ محمد ایوب و حافظ محمد رحمت مرحوم	١٩٦٣ء	مؤلفِ تذکرۂ ہذا۔
٢	حافظ عبد السلام	کوٹ پنڈی داس	〃 〃	١٩٦٣ء ١٩٦٤ء	
٣	حافظ عبد القدوس ولد حافظ محمد ایوب صاحب	〃 〃	〃 〃	〃	موضع کوٹ پنڈی داس کی بڑی مسجد میں اپنے والد گرامی کے معاون اور درجۂ حفظ کے مدرس ہیں
۴	حافظ مہر دین ولد عبد العزیز	〃 〃	〃 〃	〃	

نمبر شمار	نام و ولدیت	پتہ (بوقت حفظ قرآن)	استاد	سال اختتام	موجودہ کیفیت
۵	حافظ محمد شفیع ولد حاجی محمد یوسف	گوٹھ لبی ضلع سانگھڑ	حافظ محمد ایوب و حافظ محمد رحمت (مرحوم)	۱۹۶۳ء و ۱۹۶۴ء	بریانی، ضلع سانگھڑ میں، ایک مسجد کے امام و مدرس ہیں۔
۶	حافظ مہر الدین ولد محمد رمضان	کوٹ پنڈی داس	〃	〃	باٹا پور لاہور میں ایک مسجد کے امام و مدرس ہیں۔
۷	حافظ محمد مشتاق ولد محمد سلیمان	ایچو گل، لاہور	〃	〃	
۸	حافظ شبیر احمد ولد کریم بخش	شاہدرہ	〃	〃	حافظ محمد لیس صاحب کے قریبی ساتھی، مدرسہ کے سابق استاد اور فی الوقت ایک مدرسہ کے انچارج، فاضل جامعہ مدنیہ۔
۹	حافظ محمد حسن طارق ولد محمد سلیمان	ایچو گل لاہور	〃	〃	جامع مسجد عزیز رشید گلشن راوی لاہور میں امام و مدرس
۱۰	حافظ خورشید انور ولد شاہ محمد	پبی ضلع پشاور	حافظ محمد سعید	۲۰ ستمبر ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۶ء ۱۳۸۴ تا ۶ شعبان ۱۳۸۶	
۱۱	حافظ محمد منیر ولد کریم بخش	گوٹھ لبی، ضلع سانگھڑ	حافظ محمد لیس	〃	موضع کھیالی، گوجرانوالہ میں ذاتی کاروبار۔
۱۲	حافظ محمد اسماعیل ولد کرم بخش	خانیوال	〃	〃	
۱۳	حافظ فضل سبحان ولد قاری خان زمان	کوہاٹ	〃	〃	

شمار نمبر	نام و ولدیت	پتہ (بوقت حفظ قرآن)	اُستاد	سال اختتام	موجودہ کیفیت
۱۴	حافظ فضل منّان بن قاری خان زمان	کوہاٹ	حافظ محمد یٰس	۳۰ ستمبر ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۶ء ۱۳۸۴ھ تا ۹ شعبان ۱۳۸۶	
۱۵	حافظ محمد رمضان ولد محمد بشیر	موضع لبسمیہ، ضلع لاہور	حافظ محمد سعید	"	فاضل جامعہ مدنیہ، گوالمنڈی لاہور میں اپنا کاروبار۔
۱۶	حافظ محمد حنیف ولد امام الدین	کوٹ پنڈی داس	"	"	"	
۱۷	حافظ فیض محمد ولد محمد رمضان	"	حافظ محمد یٰس		
۱۸	حافظ خوشی محمد اعجاز ولد علی حسن	لبسمیہ لاہور	حافظ محمد سعید	"	فاضل جامعہ مدنیہ، امریکہ میں ایک مدرسہ حفظ القرآن کے منصرم اعلیٰ۔
۱۹	حافظ سعید اللہ ولد حافظ عبدالواحد	شیخوپورہ شہر	حافظ محمد یٰس	"	شیخوپورہ کے کسی اسکول میں استاد ہیں۔
۲۰	حافظ محمد یٰس ولد مہدی حسن	کوٹ پنڈی داس	"	"	فیصل آباد کے ایک مدرسہ میں مدرس ہیں۔
۲۱	حافظ محمد رمضان ولد کرم بخش	"	"	"	فاضل جامعہ مدنیہ، جامع مسجد القدس گوالمنڈی میں امام و خطیب اور مدرسہ مظاہر العلوم کے منتظم اعلیٰ
۲۲	حافظ محمد منیر ولد جیونا	"	"	"	۲۷-۳-۸۷ء	کوٹ پنڈی داس میں ایک مدرسہ کے انچارج ہیں۔
۲۳	حافظ محمد یعقوب ولد نیاز محمد	"	"	"	۲۷-۳-۸۷ء	

نمبر شمار	نام و ولدیت	پتہ (بوقت حفظ قرآن)	اُستاد	سال اختتام	موجودہ کیفیت
۲۴	حافظ محمد الیاس ولد قطب الدین	کوٹ پنڈیداس	حافظ محمد سعید	۸-۹-۸۷ء	درجۂ حفظ کے مدرس ہیں۔
۲۵	حافظ خورشید عالم ولد ملا محمد ابراہیم	مسندہ، ضلع گوجرانوالہ	حافظ محمد الیاسؒ	۲۵-۹-۸۷ء	حافظ محمد الیاس صاحب کے ہم زلف اور فیصل آباد میں درجۂ حفظ کے اُستاد ہیں۔
۲۶	حافظ محمد بشیر ولد کریم الدین	ایچوگل لاہور	حافظ محمد سعید	۲۹-۱۱-۸۷ء	۷۹-۱۹۸۰ء میں عالم شباب میں بجلی کا جھٹکا لگنے سے وفات پاگئے
۲۷	حافظ محمد اشرف ولد نیاز محمد	لبسمیہ، لاہور	حافظ محمد الیاسؒ	۲۹ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ	مسجد القدس، اچیس فیکٹری شاہدرہ میں مدرس ہیں۔
۲۸	حافظ محمد عبداللہ ولد فتح محمد	کوٹ پنڈیداس	〃 〃	۵ محرم ۱۳۸۸ھ	لاہور میں درجۂ حفظ کے استاد اور ایک مسجد کے منصرم ہیں۔
۲۹	حافظ محمد صابر ولد احمد	〃 〃	〃 〃	〃	تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران ۹ اپریل ۱۹۷۷ء کو مال روڈ پر سینے پر گولی کھاکر جام شہادت نوش کیا۔
۳۰	حافظ محمد اسماعیل ولد بابو	〃 〃	حافظ محمد سعید	۱۶ ربیع الاوّل ۱۳۸۸ھ	کوٹ پنڈی داس کی ایک مسجد کے امام ہیں۔
۳۱	حافظ عبدالرحمٰن چشتی ولد فتح دین	〃 〃	〃	۱۱ جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ	کوٹ پنڈی داس کے معروف تاجر، خطیب اور پختہ کار حافظ ہیں۔

نمبر شمار	نام و ولدیت	پتہ بوقت حفظ قرآن	اُستاد	سال اختتام	موجودہ حالات
۳۲	حافظ محمد عبدالجبار ولد غلام کبیر	تیگہ منڈیالہ ضلع گوجرانوالہ	حافظ محمد سعید	۱۸ جمادی الثانی ۸۹ھ	بی اے، گوجرانوالہ کے ایک اسکول میں استاد ہیں۔
۳۳	حافظ محمد یامین ولد محمد شریف	کوٹ پنڈیداس	حافظ محمد الیاس	۱۰ صفر ۱۳۸۹ھ ۲۸ اپریل ۱۹۶۹ء	اپنے والد صاحب مرحوم کی جگہ دوکان چلاتے ہیں۔
۳۴	حافظ جمیل احمد ولد غلام رسول	"	حافظ محمد سعید و حافظ محمد فاروق	۲۲ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ	سنت نگر لاہور میں خطیب و امام اور درجہ حفظ و ناظرہ کے منتظم اعلیٰ ہیں
۳۵	حافظ جان محمد ولد محمد الیاس	للیانی، قصور	حافظ محمد سعید و حافظ محمد الیاس	۱۸ جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ	
۳۶	حافظ محمد بشیر ولد عبدالغفور	کوٹ پنڈیداس	"	۲۲ ذیقعدہ ۱۳۸۹ھ ۳۱ جنوری ۱۹۷۰ء	
۳۷	حافظ مہرالدین ولد محمد ابراہیم	"	"	"	
۳۸	حافظ محمد بشیر ولد عمرالدین	"	"	۲ صفر ۱۳۸۹ھ ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء	لاہور میں ایک جگہ مدرس ہیں۔
۳۹	حافظ محمد فاروق ولد عبدالرحیم میواتی	للیانی ضلع قصور	سابقہ تین استاد حافظ محمد الیاس	" ۲۷ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ	
۴۰	حافظ رشید احمد ولد نواب الدین	کوٹ پنڈیداس	"	۳ جون ۱۹۷۰ء	
۴۱	حافظ محمد عباس ولد محمد اسمٰعیل ارائیں	"	"	"	اسلام آباد میں ایک سکول کے اُستاد ہیں۔

نمبر شمار	نام و ولدیت	پتہ بوقت حفظ قرآن	استاد	سال اختتام	موجودہ حالات
۴۲	حافظ بشیر احمد ولد شیر محمد پہلوان	کوٹ پنڈیداس	سابقہ مہتمم استاد و حافظ محمد الیاس	۳ جمادی الثانیہ ۱۳۹۰ھ ۶ اگست ۱۹۷۰ء	
۴۳	حافظ نذیر احمد ولد محمد ابراہیم نمبردار	″	″	″	اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔
۴۴	حافظ محمد الیاس ولد فتح محمد	″	″	″	
۴۵	حافظ محمد یعقوب ولد علی محمد	″	حافظ غلام محمد	۲۳ جمادی الثانی ۱۳۹۰ھ ۲۵ اگست ۱۹۷۰ء	مدرسہ کاشف العلوم کوٹ پنڈیداس میں فی الوقت استاد ہیں۔
۴۶	حافظ عیش محمد ولد عمر خان میو۔	للیانی ضلع قصور	حافظ محمد الیاس کرنالوی	۸ رجب ۱۳۹۰ھ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۰ء	
۴۷	حافظ احمد علی ولد حاجی محمد رمضان	کوٹ پنڈیداس	″	″	حافظ صاحب کے برادر نسبتی فی الوقت موضع مذکور میں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال اور کاروبار کرتے ہیں۔
۴۸	حافظ محمد الیاس ولد قطب الدین	″	حافظ غلام محمد	۲۲ رجب ۱۳۹۰ھ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۰ء	ایک دینی مدرسہ میں مدرس ہیں۔
۴۹	حافظ غلام مصطفیٰ ولد محمد حسین	ہاتھی ونڈ تحصیل بھلوال	حافظ محمد الیاس	۲۲ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ ۲۳ نومبر ۱۹۷۰ء	کوٹ عبدالمالک میں ایک مسجد و مدرسہ کے منتظم ہیں
۵۰	حافظ غلام رسول ولد محمد اسماعیل	کوٹ پنڈیداس	″	۳۰ محرم ۱۳۹۱ھ ۱۹۷۱ء	

نمبر شمار	نام و ولدیت	پتہ بوقت حفظ قرآن	اُستاد	سال اختتام	موجودہ حالات
۵۱	حافظ محمد شفیع ولد عمر خان	للیانی ضلع قصور	حافظ محمد الیاسؒ	۲۵ رجب ۱۳۹۱ھ ۱۶ ستمبر ۱۹۷۱ء	
۵۲	حافظ نور الاسلام ولد مشتاق احمد میوانی	امریک سنگھ والا ضلع قصور	حافظ غلام محمد	۲۵ شعبان ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء	
۵۳	حافظ محمد جمیل ولد تاج علی	کوٹ پنڈیداس	حافظ محمد الیاسؒ	۲۷ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ ۱۰ جون ۱۹۷۲ء	
۵۴	حافظ محمد ابراہیم ولد علی حسن	”	قاری تاج محمد	”	آجکل سعودی عرب میں ملازم ہیں
۵۵	حافظ محمد جمیل ولد محمد سلیمان	چادر چک نمبر ۳ شیخوپورہ	حافظ محمد الیاسؒ و قاری تاج محمد	۲۹ جمادی الثانی ۱۳۹۲ھ ۱۰ اگست ۱۹۷۲ء	منڈیالہ تیگہ، ضلع گوجرانوالہ میں ایک مدرسہ میں مدرس ہیں۔
۵۶	حافظ محمد رفیق ولد عبد المجید	کوٹ پنڈیداس	حافظ محمد الیاسؒ	۵ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۲ء	لاہور میں مدرسہ حفظ القرآن میں مدرس ہیں۔
۵۷	حافظ محمد اصغر علی ولد وسوندیا	”	قاری تاج محمد	۱۴ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۲ء	
۵۸	حافظ محمد اعظم ولد فضل الٰہی	نتھو جٹ دی گلی گوجرانوالہ	حافظ محمد الیاسؒ	۱۶ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ ۲۳ دسمبر ۱۹۷۲ء	
۵۹	حافظ دین محمد ولد محمد شفیع	کوٹ پنڈیداس	”	۱۱ محرم ۱۳۹۳ھ ۱۵ فروری ۱۹۷۳ء	
۶۰	حافظ محمد آصف ولد محمد شفیع	”	”	۲۰ صفر ۱۳۹۳ھ ۱۵ اپریل ۱۹۷۳ء	

نمبر شمار	نام و ولدیت	پتہ بوقت حفظ قرآن	اُستاد	سال اختتام	موجودہ کیفیت
۶۱	حافظ نور محمد ولد کلیم اللہ	للیانی ضلع قصور	حافظ محمد الیس رح	۲۲ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ ۲۶ اپریل ۱۹۷۳ء	کراچی کے ایک مدرسہ میں استاد ہیں۔
۶۲	حافظ محمد حق نواز ولد حاجی محمد شریف	کوٹ پنڈیداس	″	۱۱ جمادی الثانی ۱۳۹۳ھ ۱۲ جولائی ۱۹۷۳ء	
۶۳	حافظ غلام سرور ولد عمر خان	للیانی ضلع قصور	قاری تاج محمد	۱ شعبان ۱۳۹۳ھ ۳۰ اگست ۱۹۷۳ء	
۶۴	حافظ محمد الیس ولد سردار محمد	کوٹ پنڈیداس	حافظ محمد الیس رح	″	سیالکوٹ میں ایک مدرسہ کے مدرس ہیں۔
۶۵	حافظ محمد وکیل ولد محمد صدیق	″	″	۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ ۱۱ جون ۱۹۷۴ء	فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور۔
۶۶	حافظ مقبول ولد سعید احمد	ہاتھی ونڈ تحصیل چونیاں	قاری شبیر احمد	۲۷ جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ ۱۸ جولائی ۱۹۷۴ء	
۶۷	حافظ محمد یعقوب ولد دوست محمد المعروف بہ بوندھو	کوٹ پنڈیداس	حافظ محمد الیس	۱۳ شعبان ۱۳۹۴ھ یکم ستمبر ۱۹۷۴ء	فاضل جامعہ مدنیہ۔ لاہور
۶۸	حافظ قمر الدین ولد نواب الدین	ہاتھی ونڈ تحصیل چونیاں	قاری شبیر احمد	۵ رجب ۱۳۹۴ھ ۲۵ جولائی ۱۹۷۴ء	
۶۹	حافظ عبد الغفور ولد محمد صدیق	کوٹ پنڈیداس	″	۱۴ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ ۲۷ اپریل ۱۹۷۵ء	
۷۰	حافظ غلام سرور ولد علم الدین	سوانی پوسٹ سرگیا ضلع سیالکوٹ	″	″	″

نمبر شمار	نام و ولدیت	پتہ بوقت حفظ قرآن	اُستاد	سال اختتام	موجودہ کیفیت
۷۱	حافظ محمد الیس ولد عمر الدین	کوٹ پنڈیداس	حافظ محمد الیسؒ	۴ رجب ۱۳۹۵ھ ۱۵ جولائی ۱۹۷۵ء	۱۹۸۰ء میں وفات پاگئے۔
۷۲	حافظ عبدالشکور ولد محمد یوسف	بسیہ ضلع لاہور	قاری شبیر احمد	۴ محرم ۱۳۹۶ھ ۷ جنوری ۱۹۷۶ء	
۷۳	حافظ عبدالکریم ولد محمد منشی	کوٹ پنڈیداس	حافظ محمد الیسؒ	۲ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ ۴ مارچ ۱۹۷۶ء	جامعہ قاسمیہ۔ رحمٰن پورہ میں درجہ حفظ کے مدرس ہیں۔
۷۴	حافظ سمیع اللہ ولد عمر خان	للیانی ضلع قصور	حافظ شبیر احمد	۲۶ جمادی الاول ۱۳۹۶ھ ۲۶ مئی ۱۹۷۶ء	
۷۵	حافظ حفیظ الرحمٰن ولد شاہ محمد	مانگا منڈی، لاہور	حافظ محمد الیس	۷ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ ۱۸ اپریل ۱۹۷۶ء	
۷۶	حافظ محمد مشتاق ولد محمد رمضان	متراں والی، ضلع سیالکوٹ	قاری شبیر احمد	۲۱ رجب ۱۳۹۶ھ ۲۰ جولائی ۱۹۷۶ء	فاضل جامعہ مدنیہ لاہور
۷۷	حافظ محمد اسلم ولد عبدالغنی	کوٹ پنڈیداس	"	۲۴ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۶ء	
۷۸	حافظ محمد عرفان ولد عبدالرحیم	للیانی ضلع قصور	حافظ محمد الیسؒ	۱۳ صفر ۱۳۹۷ھ ۳ فروری ۱۹۷۷ء	فاضل جامعہ اشرفیہ، لاہور
۷۹	حافظ عبدالستار ولد امام الدین	علی پور ٹبہ، شیخوپورہ	"	۲۳ ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ ۶ نومبر ۱۹۷۷ء	فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ
۸۰	حافظ محمد فاروق ولد عبدالمجید	کوٹ پنڈیداس	قاری شبیر احمد	۷ محرم ۱۳۹۸ھ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۷ء	شاہدرہ، لاہور کی ایک مسجد میں امام و مدرس ہیں۔

نمبر شمار	نام و ولدیت	پتہ بوقت حفظ قرآن	استاد	سال اختتام	موجودہ کیفیت
۸۱	حافظ حفیظ الرحمٰن ولد حبیب الرحمٰن	کوٹ پنڈیداس	حافظ محمد لیس ؒ	۱۵ محرم ۱۳۹۸ھ ۲۶ دسمبر ۱۹۷۷ء	کوٹ پنڈی داس کی ایک مسجد کے امام و خطیب ہیں۔
۸۲	حافظ عبد القیوم ولد غوث محمد	منڈی بہاؤالدین گجرات	قاری شبیر احمد	۳ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ھ یکم فروری ۱۹۷۹ء	
۸۳	حافظ محمد امین ولد محمد انور	کوٹ پنڈیداس	حافظ محمد لیس ؒ	۲۸ جمادی الثانیہ ۱۳۹۹ھ ۲۶ مئی ۱۹۷۹ء	سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہیں۔
۸۴	حافظ محمد صدیق ولد شمس الدین	″	حافظ شبیر احمد	۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء	شیخوپورہ کی ایک مسجد میں امام و مدرس ہیں۔
۸۵	حافظ محمد رمضان	گرین کوٹ لاہور	حافظ محمد لیس ؒ	۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء	ملتان وآدم میں ایک مسجد میں امام و مدرس ہیں۔
۸۶	حافظ عیش محمد ولد فتح دین	کوٹ پنڈیداس	حافظ شبیر احمد	۵ جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ ۱۱ فروری ۱۹۸۱ء	
۸۷	حافظ محمد اسمٰعیل ولد حافظ محمد لیس	″	حافظ محمد لیس ؒ	۲ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ یکم اکتوبر ۱۹۸۱ء	فی الوقت مدرسہ کاشف العلوم میں مدرس اور "مسجد مدینہ" میں اپنے والد کی جگہ امام ہیں۔

تذکرہ

رحمۃ اللہ تعالیٰ

ترتیب و تدوین

ایم اے، پی ایچ ڈی

شائع کردہ

کوٹ پنڈی داس، ضلع شیخوپورہ